بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب
شمارہ جون-2024 جلد نمبر 17
Tahreek-e-adab vol-17, issue-78 June 2024

Editor مدیر
**Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad) جاوید انور (ڈاکٹر جاوید احمد)
cell-0091-9935957330

مجلس ادارت
Editorial board and Peer Review committee
پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.
پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی
Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University
ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہ عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی
Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)
پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی
Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)
پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)
Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)
ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا
Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata
ڈاکٹر احسان حسن، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

# مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee
نجمہ عثمان، پروفیسر عارفہ بشریٰ، رشید احمد،
عرفان عارف، ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)
Prof. Arifa Bushra (Dept. of Urdu,Kashmir University)
Rasheed Ahmad (Chairman Rosewood Academy,VNS)
Ishtiyaq Ahmad ( General Secretary, Sir syed society Varanasi)
Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,
Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)
ISSN 2322-0341
Vol-17 (جلد نمبر 17) Year of Publication 2024 :سال اشاعت
Issue May 2024، شمارہ نمبر، شمارہ 78۔جون
Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi سرنامہ خطاط: انور جمال
Title cover Uzma Screen, Varanasi عظمیٰ اسکرین : سرورق
200/-Two Hundred rs. per copy دوسو روپے : فی شمارہ
زر سالانہ : دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)
Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087

State Bank Of India,Branch-Shopping centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے مہاویر پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from mahavir press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| 1۔کرامات مسجد نبوی | نجمہ عثمان | 6 |
| 2۔حسن شناسی (میں زندہ آدمی ہوں) | خالد حسین | 12 |
| **گوشہ زنفر کھوکھر** | | 31 |
| 1۔زنفر کھوکھر کا فن: مشاہیر کی آراء | | 32 |
| 2۔زنفر کھوکھر | ولی محمد اسیر کشتواڑی | 38 |
| 3۔"عبرت" کے افسانے | خالد حسین | 41 |
| 4۔زنفر کھوکھر کی افسانوی دنیا | دیپک بدکی | 46 |
| 5۔اردو ادب کی گونجتی گرجتی افسانوی آواز | اشرف محمود نندن | 54 |
| 6۔زنفر کھوکھر کے افسانے | محمد شاہد پٹھان | 56 |
| 7۔زنفر کھوکھر کی افسانوی جہات | ڈاکٹر جاوید انور | 75 |
| زنفر کھوکھر کے منتخب افسانے | | |
| 1۔ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے | | 81 |
| 2۔زور کا جھٹکہ | | 83 |
| 3۔آخری فیصلہ | | 85 |
| 4۔ارے! کوئی ہے! | | 87 |
| **مضامین** | | |
| 1۔کشمیر میں سلسلہء ریشی کا اجمالی جائزہ | محمد جاوید | 90 |
| 2۔کشمیر کے تہذیب وتمدن کی بہتری کے لئے فارسی زبان وادب | | |
| کے دانشوروں کے کارنامے | محمد جاوید، محمد اکرم | 98 |
| 3۔غیر مسلم نعت گو شعرا | اعجاز احمد ڈار | 105 |

4۔حجاب امتیاز: بحیثیت افسانہ نگار ڈاکٹر عارف ایوب شاہ 113
5۔سر علامہ اقبال: بحیثیت فلسفی ڈاکٹر آصف علی جان 119
6۔افسانہ" آزادی کی تلاش: ایک جائزہ عرفان احمد ڈار 124
7۔عاصی فائقی: بحیثیت نظم گو محمد الطاف انصاری 131
8۔کاچو اسفندیار خان کی انشائیہ نگاری ایس معشوق احمد 136

Karamat-e-Masjid-e-Nabvi(kitab-e-dil) by Nazma Usman (Surrey)
U.K cell-0044-7936-9117-11

نجمہ عثمان (سرے، یوکے)

# کراماتِ مسجدِ نبوی

دو چار قدم ہی چلی ہوں گی کہ کسی نے پیچھے سے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں گھبرا کر مڑی وہی گارڈ سامنے کھڑی تھی۔ میں نے پھر کہا' واپس جا تو رہی ہوں'۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور صدر دروازے کی طرف چل پڑی، میں ایک سحر میں گرفتار اس کے ساتھ کھنچی چلی گئی۔ دروازے میں اندر کی طرف اس کی اونچی شاہانہ کرسی تھی، یہ کرسیاں عموماً دونوں جانب ہوتی تھیں۔ سامنے والی پر گارڈ بیٹھی ہوئی تھی اس نے اس خالی کرسی پر مجھے بٹھاتے ہوئے کہا' یہاں بیٹھ جاؤ اور نماز پڑھو' اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ مڑ گئی میں ٹھیک سے اس کا نقاب شدہ چہرہ بھی نہیں دیکھ پائی۔ جب میرے اوسان ٹھکانے لگے تو میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، میں الحمدللہ مسجد کے اندر تھی، سامنے مسجد کا درمیانی حصہ نظر آ رہا تھا، پنکھے چل رہے تھے، جہاں میں بیٹھی تھی باہر سے ہوا آ رہی تھی اور گھٹن کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ میری کرسی کے ساتھ دائیں طرف قطار سے خواتین اپنے مصلے یا چادریں بچھائے بیٹھی تھیں اور سامنے بھی یہی سلسلہ تھا۔ میرے آس پاس کی خواتین کے چہرے پر سوالیہ نشان تھا۔ 'تمہیں یہاں کیوں بٹھایا گیا ہے'؟ میرے پاس جواب نہیں تھا، اس رب غفور کا شکر بجالاتے ہوئے میں نے دعاؤں کی کتاب نکال لی، ابھی چند سورتیں ہی پڑھی تھیں کہ دائیں طرف بیٹھی ہوئی خاتون نے اونچی آواز میں تلاوت شروع کر دی ان کے لب و لہجے سے اندازہ ہو گیا کہ وہ بنگالی تھیں لیکن سبحان اللہ کمال کی خوش الحانی۔ آس پاس بیٹھی ہوئی سب خواتین ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جب وہ تلاوت کر چکیں تو میں نے ان کی تعریف کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا آپ سورہ رحمان پڑھ کر سنا سکتی ہیں؟ ایکدم خوش ہو کر کہنے لگیں اب یہی تو پڑھنے والی تھی۔ میں نے اپنی کتاب بند کر دی اور آنکھیں بند کر لیں، وہ پڑھ رہی تھیں اور میں عالم سرور میں بیٹھی ایک ایک لفظ کو اپنے اندر اتار رہی تھی، آج ہونے والے واقعات کی ہر بات کا جواب مل رہا تھا۔

'اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے' ہمارے ہوٹل سے دیر سے نکلنے میں

مصلحت تھی، میرے یہاں دھکے کھانے میں بھی مصلحت تھی، مجھے مسجد کے اندر نماز پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی اس سے بڑی نعمت کیا ہوتی۔ (بعد میں زبیر نے بتایا کہ ماشااللہ انہیں بھی مسجد کے اندر آسانی سے نماز مل گئی تھی)۔ وہ پڑھتی رہیں، سورہ رحمن کا ایک ایک حرف دل پر نقش ہوتا رہا۔ اِدھر ان کی تلاوت ختم ہوئی اُدھر امامِ مسجد نے تکبیر شروع کر دی۔ جو خواتین کھڑی ہو سکتی تھیں نماز کے لئے صف آرا ہو گئیں، میری کرسی خاصی اونچی تھی اس لیے بہتر سمجھا کہ نیت باندھنے کے بعد بیٹھ جاؤں ،سبحان اللہ کیا روح پرور منظر تھا، اس دن غالباً امام نے فرض کی رکعتوں میں سورہ رحمن کے ہی رکوع پڑھے (یادداشت ساتھ نہیں دے رہی اس لیے معذرت اگر یہ سورہ کسی اور نماز میں پڑھی گئی)۔ نماز ختم ہوئی، بہت اچھی دعا مانگی گئی۔ نماز کے بعد ہی فوراً کچھ خواتین باہر جانے لگتی ہیں، ہم چونکہ راستے میں تھے اس لیے تمام خواتین کو اٹھنا پڑا، دعا ابھی جاری تھی۔ میں بھی اس خیال سے اٹھ کھڑی ہوئی کہ اس گارڈ خاتون کو ڈھونڈوں اسے بھی تو نماز پڑھنی ہوگی۔ سامنے والی گارڈ ہاتھ ہلا ہلا کر خواتین کو باہر جانے کا اشارہ کر رہی تھی، دوسری صدر دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ میں اس کی طرف لپکی کہ اس کا شکریہ ادا کر سکوں، مگر یہ تو کوئی اور تھی، قد بھی چھوٹا اور فربہ جسم۔ میں دوسرے صدر دروازے تک گئی شاید وہاں ہو لیکن وہاں بھی نہیں ملی، دیر بھی ہو رہی تھی۔ میں سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے دل ہی دل میں دعائیں دیتی رہی، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا شکر بجا لائی، اپنے پیارے نبیؐ پر درود سلام کہ مجھ ناچیز بندی کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ باہر آئی اسٹینڈ اے کے آگے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ بہت زیادہ رش تھا، زبیر کافی دیر کے بعد آئے، مجھے کوئی جلدی نہیں تھی لیکن انہیں میری فکر تھی، میں نے تسلّی دی کہ آج تو اللہ تعالیٰ نے کرامات سے نوازا، ہوٹل چل کر سارا قصہ سناؤں گی۔ ان کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی، حسب عادت پینے کے لیے پانی لائے، کمرے کے لیے بوتلیں بھی بھر لیں اور ہم تازہ دم ہو کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں زبیر کو سارا واقعہ سناتی رہی۔ کہنے لگے 'سبحان اللہ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، دیر ہو گئی تھی اور باہر تک نمازی صف آرا تھے، کچھ لوگ راستہ بنا کر اندر جا رہے تھے، میں بھی چلا گیا اور مجھے نماز پڑھنے کے لیے جگہ بھی مل گئی یہ سب آپ کی دعائیں اور اللہ کا کرم ہے'۔ میں نے کہا، بے شک آج تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم دونوں پر اللہ کے فضل و کرم کی بارش ہوئی ہے، اس کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔

واپسی میں سیدھے کھانے کے لیے ریسٹورینٹ میں چلے گئے، کافی رش تھا، ہم نے بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کی اور بڑی مشکل سے دو کرسیاں ملیں۔ میں نے حسبِ عادت دال چاول اور سبزی

پر اکتفا کیا البتّہ زبیر نے ماشاللہ مرغی اور گوشت کی ڈشز چکھیں اور میٹھا بھی شوق سے کھایا۔ میں نے کچھ پھل لے لیے، ابھی تک معدہ نے گرانی کی شکایت نہیں کی تھی اور میں چاہ رہی تھی کہ انشاءاللہ آگے بھی یہی سلسلہ رہے۔ کھانے کے دوران میں اِدھر اُدھر نظر دوڑاتی رہی، حیرت کی بات تھی ہمیں مدینہ آئے دوسرا روز تھا اور ناہید پروین کی فیملی کہیں نظر نہیں آئی، ہمارے گروپ کے باقی لوگ بھی اِکّا دُکّا دکھائی دیے۔ مدینے میں قیام کے دوران میں نے یہ بات بلکہ یہ کمی محسوس کی کہ جہاں اور گروپ کے لوگ کھانے کے وقت یا نماز کے لیے باقاعدہ ساتھ جاتے تھے ہمارے گروپ پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی، ایک لحاظ سے یہ اچھا بھی تھا کہ جس کو جب سہولت ہو وہ کام کر لے۔ جب میں مسجدِ نبوی نماز کے لیے جاتی تھی تو مجھے خیال آتا تھا کاش ہمارے گروپ کی کچھ خواتین بھی ساتھ ہوتیں۔ میں نے دیکھا تھا کہ ایرانی، سوڈانی، اور کورین خواتین کے گروپ ساتھ ساتھ رہتے تھے، ان میں جو معمر اور معذور خواتین تھیں ان کی بڑی اچھے طریقے سے دیکھ بھال ہوتی تھی اور رش کے دوران انہیں بیچ میں رکھا جاتا تاکہ وہ دھکوں سے محفوظ رہیں۔ اسی طرح نماز کے دوران سب ایک دوسرے کا خیال کرتے ،نوجوان لڑکیاں بھاگ بھاگ کر پڑھنے کے لیے قران شریف لے آتیں، پینے کے لیے پانی بھی جاتا، اس طرح ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی ضروریات کا خیال رکھا جاتا۔ میرے ساتھ الحمدللہ زبیر تھے جو میری ہر ضرورت کا خیال رکھ رہے تھے بس مسجد کے زنانہ حصّے میں نہیں آسکتے تھے، اور یہاں سبحان اللہ اکیلے ہوتے ہوئے بھی مجھے یوں لگتا تھا میں اکیلی نہیں ہوں۔ کوئی ہے جو میرے ساتھ ہے ۔کھانا کھا کر ہم اپنے کمرے میں آ گئے، میں نے زبیر سے کہا آج میرا دل چاہ رہا ہے مسجد میں بیٹھ کر عبادت کروں، میں سوچ رہی ہوں مغرب سے پہلے چلی جاؤں پھر عشاء پڑھ کر لوٹوں۔ زبیر بولے آپ دیکھ لیں اتنی دیر کرسی پر بیٹھ سکتی ہیں؟ تھک جائیں گی'۔ میں نے کہا کوشش تو کر سکتی ہوں ورنہ ہوٹل واپس آجاؤں گی، اب تو مجھے راستہ یاد ہو گیا ہے، وہ میری بات مان ہو گئے۔

ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا، عصر کی نماز میں نے کمرے میں پڑھی، زبیر مسجد چلے گئے، واپسی میں دیر ہو گئی۔ میں پریشان تھی کہاں رہ گئے۔ آ کر بتایا عصر کے بعد نیچے لاؤنج میں گروپ میٹنگ تھی۔ کل علی الصبح کوچ ٹرپ ہے مسجد منورہ کی زیارات کے لیے جانا ہے۔ میں نے پوچھا کس کس سے ملاقات ہوئی؟ بتانے لگے کافی لوگ تھے شیشو اور منٹو بھی ملے۔ ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے نیچے چلے گئے مجھے مسجد میں دیر تک بیٹھنا تھا اس لیے کچھ کھانا پینا ضروری ہو گیا تھا، چائے اور کیک بسکٹ لے لیے، کچھ اسنیکس بیگ میں ڈال لیے۔ زبیر مجھے مسجد چھوڑ کر آ گئے کیونکہ ابھی مغرب کی

نماز میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔

عورتوں والا حصہ ابھی بھرنا شروع ہوا تھا، میں سیڑھیاں چڑھ کر پہلے صدر دروازے سے اندر چلی گئی لیکن داخل ہونے سے پہلے میری متجسس نگاہیں اس گارڈ خاتون کو ڈھونڈ رہی تھیں جس کی وجہ سے مجھے جمعہ کی نماز مسجد کے اندر پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ وہ خوبصورت مہربان آنکھیں میں نہیں بھول سکتی تھی، لیکن صد افسوس جب تک ہمارا قیام مدینہ میں رہا اور میں نماز کے لیے مسجدِ نبوی آئی، وہ خاتون دوبارہ نظر نہیں آئیں۔ بہر حال اس دن مسجد میں داخل ہو کر میں نے دائیں طرف کا رخ کیا، الحمدللہ کافی جگہ تھی، میں نے اپنی فولڈنگ کرسی پیچھے جا کر کھول لی بیٹھ کر مسجد کے نفل پڑھے، پھر درود و سلام پڑھتی رہی۔ عورتوں کا حصہ آہستہ آہستہ بھرنا شروع ہو گیا، اِدھر مغرب کی اذان ہوئی ادھر یوں لگا جیسے دونوں داخلی دروازوں سے خواتین کا ایک سیلاب سا امڈ کر ادھر ادھر پھیل گیا۔ جو بچی کھچی جگہیں تھیں وہ بھر گئیں، پھر گارڈ خواتین اندر آ گئیں اور خواتین کو راستوں میں بیٹھنے سے منع کرنے لگیں، جو فٹ نہیں ہو سکیں انہیں باہر دوسرے حصے میں جانا پڑا۔ میرے دائیں بائیں اور سامنے وہیل چیرز اور اسٹول یوں جوڑ کے رکھ دیے گئے تھے کہ میں صرف سر آگے کی طرف جھکا سکتی تھی۔ اللہ کا بڑا کرم تھا، مغرب کی نماز بڑے سکون سے ادا کی۔

نماز کے بعد میری طرف کا حصہ خالی ہونا شروع ہو گیا، میں اطمینان سے بیٹھی دعائیں پڑھتی رہی۔ پندرہ بیس منٹ میں خواتین کے سامنے والے حصے بھی خالی ہو گئے۔ اب وہ خواتین رہ گئی تھیں جو عشاء کی نماز تک رکنا چاہتی تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا جب بیٹھے بیٹھے تھک جاؤں گی تو اٹھ کر ایک چکّر لگا لوں گی۔ میری دائیں طرف ایک گروپ بیٹھا ہوا تھا ان میں جو ادھیڑ عمر کی تھیں وہ آرام سے لیٹ گئی تھیں، دو جوان لڑکیاں ابھی تک قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں، ان سب نے بڑی گھیر کی شلوار، قمیض اور بکل مار کے چادریں اوڑھی ہوئی تھیں۔ حلیے سے پنجاب کی لگ رہی تھیں اور گفتگو بھی پنجابی میں کر رہی تھیں۔ میں نے ان لڑکیوں سے کہا 'میں ذرا پانی پینے اور اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے جا رہی ہوں، کیا آپ میری کرسی کا خیال رکھیں گی اس پر رگ سیک رکھ کر جا رہی ہوں'۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے وہ ادھیڑ عمر کی خاتون اٹھ کر بیٹھ گئیں اور خالص پنجابی نما اردو میں یقین دلایا کہ وہ میری کرسی کی حفاظت کریں گی، میں بےفکری سے جاؤں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، اٹھ کر گئی، ہمارے حصے کے دائیں طرف پانی کے ڈرم رکھے ہوئے تھے، گلاس لے کر جھک کے پانی نکالا، بس اتنا پی لیا کہ حلق تر ہو جائے ابھی عشاء تک بیٹھنا تھا۔ پھر آگے تک جا کر خواتین کے حصے کا پورا چکّر لگا لیا

۔دوسرے داخلی دروازے کے سامنے کا حصہ کافی بھرا ہوا تھا۔بعد میں پتہ چلا یہاں سب ریاض الجنتہ جانے کے لیے ابھی سے آ کر بیٹھ گئی ہیں،ایسا لگتا تھا یہ ان کے روز کا معمول ہے(بعد میں یہ بات سچ ثابت ہوئی)۔کچھ لیٹ کر باقاعدہ نیند پوری کر رہی تھیں،کچھ کھانے پینے میں مصروف تھیں اور چند ایسی بھی تھیں جو مسلسل عبادت کر رہی تھیں۔بہر حال میں تھوڑی دیر چل پھر کر واپس آ گئی۔

ان خاتون کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے میری کرسی کی حفاظت کی۔وہ بولیں آپ کا جب جی چاہے اٹھ کر جائیں میں یہاں بیٹھی ہوں نا۔مزید شکریہ ادا کرتے ہوئے میں بیٹھ گئی اور عبادت میں مصروف ہوگئی۔اب آہستہ آہستہ مسجد بھرنی شروع ہوگئی تھی،سب سے پہلے ہمارا حصہ بھرنا شروع ہوا ،پھر سامنے اور ہمارے دائیں طرف کے حصے،کچھ خواتین کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے انہوں نے پانی کے ڈرمز کے پاس کھڑے ہو کر پانی سے کھیلنا شروع کر دیا۔میں اپنی چھوٹی بوتل میں پانی بھر کر لے آئی تھی اس لیے ادھر جانے کی نوبت نہ آئی۔ڈرمز کے اردگرد پانی ہی پانی تھا،پھر کسی نے گارڈز کو بتایا ہوگا فوراً صفائی کرنے والی آ گئی اس نے بچوں کو بھگایا اور گرا ہوا پانی خشک کیا،اندیشہ تھا کوئی بھی وہاں پھسل کر گر سکتا تھا۔

عشاء کی نماز میں ابھی دیر تھی،میں ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے کھڑی ہوگئی،اس وقت جگہ چھوڑ کر جانا مناسب نہیں تھا،پھر میرے اِرد گرِد وہیل چیرز لگ چکی تھیں۔میں نے مسجد کا جائزہ لیا،یوں تو ماشاللہ تین عمرے کر چکی ہوں،ان میں سے دو عثمان صاحب اور زبیر کی فیملی کے ساتھ اور ایک اپنی خالہ اور ماموں کے ساتھ کیا تھا۔ہر دفعہ وہاں پھر سے آنے کی آرزو میں اضافہ ہو جاتا تھا ۔مسجدِ نبوی میں عبادت کرنے سے جو سکون ملتا ہے وہ نا قابل بیان ہے۔نبیِ کریم کا فرمان ہے''جو شخص میری مسجد میں ۴۰ نمازیں لگا تار ادا کرے اور درمیان میں کوئی نماز قضا نہ ہو تو وہ دوزخ کی آگ،عذاب اور نفاق سے بری ہو جاتا ہے''۔(ترمذی،احمد)

احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ'مسجدِ نبوی میں ایک نماز ادا کرنا دوسری مساجد میں پچاس ہزار نمازیں ادا کرنے سے افضل ہے'(بخاری مسلم)

میں سوچ رہی تھی ابھی سب سے بڑی سعادت سرورِ کونین کے روضہء اقدس کی حاضری ہے،لیکن وہاں تک جانے کے لیے اس قیامت خیز دھکم پیل میں،نہ میری ہمت تھی اور نہ ہی زبیر نے اجازت دی تھی۔سارا دارومدار اس بات پر تھا کہ کوئی ایسی خاتون مل جائیں جو مجھے سنبھال سکیں اور خود یہ فریضہ بھی انجام دے چکی ہوں۔میں نے اس رات عشاء کے بعد بہت دعا کی'اللہ میاں بھیج کوئی

ایسی مہربان خاتون، دکھا اپنی کرامات، تیرے خزانے میں تو کسی چیز کی کمی نہیں ہے'۔

عشاء کی نماز کے بعد بھیڑ چھٹنے پر میں باہر نکل آئی، اسٹینڈ اے پر پہنچی تو زبیر میرے منتظر تھے۔ میں نے کہا اتنی جلدی آ گئے، بولے مجھے فکر ہو رہی تھی آپ اتنی دیر بیٹھی رہیں ہیں تھک گئی ہوں گی پھر یہاں آ کر انتظار کرتیں اس لیے میں جلدی آ گیا۔ میں نے ڈھیروں دعائیں دیں اور اطمینان دلایا کہ ماشاللہ میرا وقت بہت اچھا گزرا۔ ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ پہلے ریسٹورینٹ میں گئے کیونکہ بھوک لگ رہی تھی۔ دال کا گرم گرم سوپ تھا وہ پیا پھر چاول کے ساتھ سبزی اور سالن لے لیا۔ زبیر حسب عادت نمونے کے لیے کئی چیزیں لے آئے، کھا پی کر ہم لوگ اپنے کمرے میں آ گئے، صبح کوچ میں ٹرپ پر نکلنا تھا، اس کیے لیے ناشتہ ساڑھے چھ بجے تک اور کوچ میں ساڑھے سات بجے تک بیٹھ جانا تھا۔ ہمارا کوچ نمبر 4 تھا اور میٹنگ میں بتایا گیا تھا کہ کوچ میں مرد آگے اور خواتین پیچھے بیٹھیں گی۔

☆☆☆

Sukhan Shanaasi (Main Zinda Aadmi hoon) by Khalid Hussain

(Jammu) cell-7006898585, 9419183485

خالد حسین (جموں)

# سُخن شناسی (میں زندہ آدمی ہوں)

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دِل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
(فیض احمد فیضؔ)

خالد حسین میری بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ ماہنامہ ''دیہات سُدھار'' کا نائب مُدیر تھا اور میں مدیر۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے میری پہچان پورے برصغیر میں بن چکی تھی۔ ادبی حلقوں میں میرا نام جانا پہچانا تھا۔ میں ملک کے نامور رسائل میں چھپتا رہتا تھا۔ جن میں ''بیسویں صدی''، ''روبی''، ''آجکل''، ''شاعر''، ''شمع'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ خالد حسین میرے افسانے پڑھتا اور اپنی رائے کھُل کر دیتا۔ اُردو ادب میں اُسکی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں نے اُسے مشہور افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی نگارشات پڑھنے کا مشورہ دیا۔ یوں تو اُس نے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا تھا اور اُس نے رام بابو سکسینہ کی ''اُردو تاریخ ادب'' پڑھی تھی۔ اُس کے علاوہ نصاب کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا لیکن وہ سب امتحانی معاملہ تھا جبکہ میرے ساتھ کام کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے ادب کی طرف مائل ہونے لگا۔ اُس نے سعادت حسن منٹو، بلونت سنگھ، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدیؔ، خواجہ احمد عباس، الیاس احمد گدّی، عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم کو پڑھا۔ کُچھ عرصے کے بعد میں نے دیکھا کہ خالد حسین کا رُجحان اُردو شاعری کی طرف زیادہ ہے۔ وہ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، جوشؔ، فراقؔ، قتیلؔ، فیضؔ، ساحرؔ اور ناصر کاظمی کو بڑے شوق سے پڑھتا اور گفتگو میں اکثر اُن کے اشعار کو دُہراتا۔ ایک دن وہ ایک کہانی اُردو میں لکھ کر لایا اور مجھے سُنانے لگا۔

کہانی دمدار تھی اور اُردو میں وہ اُسکی پہلی کہانی تھی اور اُس کا عنوان تھا۔ ''گھر کی جنت'' میں نے معمولی نوک پلک سنوار کر اُسے ماہنامہ ''دیہات سُدھار'' کے اکتوبر۔ نومبر 1969ء کے شمارے میں شائع کیا۔ یوں اُس کا افسانوی سفر شروع ہوا۔ اب تک تو آپ سمجھ ہی چُکے ہوں گے کہ میں کون

ہوں ۔ میرا نام نُورشاہ ہے۔ میں نے اورخالدحسین نے تقریباً نوسال اکٹھے کام کیا ۔ وہ نائب مُدیر سے ''دیہات سُدھار'' کا مُدیر بنا اور میں ترقی پا کر ڈپٹی ڈائریکٹر پنچایت بنا اور پھر دونوں کئی سالوں تک ایک ہی کمرے میں بیٹھتے رہے۔ 1970ء میں اُسکے دوافسانے نندگوپال باوا نے اپنی اُردو ماہوار میگزین ''نُوری چھم'' میں چھاپے۔ نام تھا ''دُھوپ اور سائے'' اور ''شیشہ گھر''۔ خالدحسین کا چوتھا افسانہ 1971ء کے اوائل میں بعنوان ''شمعٔ ہر رنگ میں جلتی ہے''۔ سری نگر کے ایک ہفتہ وار اخبار میں چھپا۔ کسی منچلے نے اُس اخبار کی کچھ کاپیاں سیکرٹریٹ میں بانٹ دیں اور ایک زلزلہ آ گیا ۔ ہرطرف افسانے کا چرچا ہونے لگا۔ اُس افسانے میں ایک بڑے سرکاری افسر جو سیکرٹریٹ میں سیکریٹری کے عہدہ پر فائز تھا اور اُسکی پی، اے کی دِل رُبائی کی داستان بیان کی گئی تھی۔ اس افسانہ میں خالدحسین نے یہ احمقانہ غلطی کی کہ کرداروں کے نام اصلی لکھ دیئے۔ ایک طوفان مچا اور خالدحسین نوکری سے معطل کردیا گیا۔ چارج شیٹ میں یہ الزام لگایا گیا کہ اُس نے ایک اعلیٰ سرکاری افسر اور ایک خاتون کے خلاف فحش مضمون لکھ کر اُنکی کردارکشی کی ہے۔ جبکہ مضمون چھاپنے سے پہلے سرکاری ملازموں کو ضابطے کے تحت منظوری لینی ضروری ہوتی ہے۔ خالدحسین نے جواب میں لکھا کہ اُس نے کوئی مضمون نہیں لکھا جس کے لئے سرکاری اجازت نامہ لینا پڑتا ہے بلکہ اُس نے ایک افسانہ لکھا ہے اور فکشن لکھنے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اُس نے فحش زبان استعمال کی ہے۔ ریاستی سرکار نے خالدحسین کی دلیل مسترد کردی اور ایک انکوائری کمیشن بنادیا جس کی سربراہی ایک سیشن جج کو دی گئی۔ اُن کا نام غلام رسول ہمدانی تھا۔ انکوائری کمیشن نے یہ ثابت کرنا تھا کہ آیا خالدحسین کی تحریر مضمون ہے یا افسانہ اور کیا اُس میں فحش زبان استعمال ہوئی ہے یا نہیں۔ انکوائری کمیشن میں خالدحسین کی طرف سے جو وکیل پیش ہوا، اُس کی دلیل تھی کہ آج تک کوئی بھی یہ ثابت نہیں کرسکا کہ فکشن میں فحش زبان لکھی جاتی ہے۔ اُس نے سعادت حسن منٹو کی مثال دی جس پر فحاشی کے الزام میں کئی مقدمے چلائے گئے لیکن کوئی بھی یہ ثابت نہیں کرسکا کہ منٹو نے فحش لکھا ہے۔ جہاں تک افسانے میں ناموں کا ذکر ہے تو وہ کسی کے بھی ہوسکتے ہیں۔ خالدحسین کے وکیل نے اپنے دلائل میں کہا کہ اس بات کا فیصلہ کرنا، کہ افسانے اور مضمون میں کیا فرق ہے اور کیا فحش زبان استعمال کی گئی ہے یا نہیں۔ یہ ماہرلسانیات، نقاد اور ادیبوں کا کام ہے۔ کیونکہ وہی صحیح فیصلہ کرسکتے ہیں۔ اس دلیل کو جج صاحب نے مان لیا۔ اور اگلی پیشی پر ماہرلسانیات، نقادوں اور ادیبوں کی تحریری آرا طلب کرلیں۔ اُن دِنوں بلراج ساہنی اور خواجہ احمدعباس ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلہ میں

کشمیر آئے ہوئے تھے۔ خالد حسین اُن سے ملا اور اپنی روداد سُنائی۔ دونوں نے کہانی پڑھی اور اپنی رائے لکھ کر دی۔ دونوں نے لکھا تھا کہ مذکورہ افسانہ ایک ادبی تخلیق ہے اور فحاشی کا الزام غلط ہے۔ بلراج ساہنی اور خواجہ احمد عباس وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کے رفیق تھے اور کمیونزم کے نظریے کے حامی۔ ایک روز صادق صاحب نے اُنھیں عشائیے پر بُلایا تھا۔ وہاں باتوں باتوں میں بلراج ساہنی نے صادق صاحب سے خالد حسین کے افسانے کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ایک نئے اُبھرتے تخلیق کار کو لال فیتہ شاہی کا شکار نہ بننے دیں اور اُسے بحال کیا جائے تا کہ اُس کے اندر کا ادیب زندہ رہے۔ خالد حسین نے کشمیری اور اُردو کے افسانہ نگار اختر محی الدین، علی محمد لون اور محمد یوسف ٹینگ سے بھی تحریری رائے حاصل کر کے سبھی تحریریں اپنے وکیل کے حوالے کیں۔ مقررہ تاریخ پر خالد کے وکیل نے جج صاحب کو سبھی آرا کو پڑھ کر سُنایا اور اصل تحریریں کمیشن کے سُپرد کیں۔ یوں نو مہینے کے بعد کمیشن نے اپنی رپورٹ ریاستی سرکار کو پیش کی۔ خالد حسین بری ہو گیا اور نوکری پر بھی بحال ہو گیا لیکن اُسکی بیوی کے زیورات مقدمہ بازی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ لیکن سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ خالد حسین کے اندر چھُپا ہوا تخلیق کار باہر آ گیا۔ اور وہ اُردو میں کہانیاں، ادبی، تاریخی، سماجی اور سیاسی مضمون لکھنے لگا اور اخباروں میں کام کرنے لگا۔ 1971ء میں ہی خالد حسین کے دوست ہر بھجن سنگھ سا گر نے اُسے پنجابی زبان میں لکھنے کی ترغیب دی۔ وہ اُسے اپنے ساتھ پنجابی ساہت سبھا کے دفتر مائسمہ میں لے گیا۔ وہاں پنجابی ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادیب اور شاعر بھی آتے تھے اور اپنی تخلیقات سُناتے تھے اور اُن پر سیر حاصل گفتگو ہوتی تھی۔ ہر بھجن کی تحریک پر خالد حسین نے پنجابی میں اپنا پہلا افسانہ ''ٹھنڈی کانگڑی'' شاید فروری 1971ء میں لکھا اور پنجابی ساہت سبھا سری نگر کی نشست میں پڑھا۔ مہارتھی کہانی کاروں کو کہانی پسند نہیں آئی خاص کر سرن سنگھ، کنول کشمیری، گور چرن سنگھ گلشن اور پریم سنگھ کو۔ دوسرے دِن یہی کہانی خالد حسین نے مجھے، ہر بھجن سنگھ سا گر، بندھو شرما، نرسنگھ دیو جموال، دینو بھائی پنت اور برج نندن کو سُنائی۔ سب نے کہانی کو سراہا اور کہا کہ پلاٹ، زبان اور بیان کے لحاظ سے یہ ایک مکمل افسانہ ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ خالد حسین نے اپنی یہ پہلی پنجابی کہانی دہلی سے نکلنے والے پنجابی کے مشہور جریدے ''ناگ منی'' میں چھپنے کے لئے بھیجی۔ ''ناگ منی'' بین الاقوامی شہرت یافتہ، ساہت اکادمی اور گیان پیٹھ ایوارڈی محترمہ امرتا پریتم کی ادارت میں نکلتا تھا۔ ''ناگ منی'' میں چھپنے والے اپنے آپکو بڑے خوش قسمت سمجھتے تھے۔ خالد حسین کی کہانی ''ناگ منی'' میں چھپی تو پاکستان کے مشہور ادیب

اور شاعر اور ماہنامہ ''کونج'' لاہور کے مُدیر احمد سلیم نے اس کہانی کو شاہ مُکھی لپی (اُردو رسم الخط) میں چھاپا۔ یوں خالد حسین کی پنجابی کہانیاں دونوں ملکوں کے پنجابی جرائد میں چھپنے لگیں۔ ''ٹھنڈی کانگڑی'' کہانی کا چرچا پنجاب میں بہت ہوا۔ پھر گرمیوں کے مہینے میں (1972) میں پنجاب اگریکلچر یونیورسٹی لُدھیانہ کے پنجابی شعبہ کے صدر ڈاکٹر سُریندر سنگھ دُوسانجھ کی سربراہی میں شعبہ کے طالب علم سیاحت کے لئے کشمیر آئے۔ اُنہوں نے گورودوارہ چھٹی پادشاہی میں خالد حسین کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہی اور اُس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ وہاں پنجابی ساہت سبھا سری نگر کے جنرل سیکریٹری پروفیسر پریم سنگھ نے اُنھیں دوسرے دِن خالصہ ہوٹل امیرا کدل میں چائے پر مدعو کیا اور کہا کہ خالد حسین کو وہ وہاں لے کر آئیں گے۔ خالد حسین کو اطلاع دی گئی اور دوسرے دِن چار بجے خالصہ ہوٹل میں طالب علموں سے ملاقات کی۔ اِس ملاقات کے بعد خالد حسین بہت خوش ہوا اور اُس میں خود اعتمادی اور بڑھی۔ طالب علموں میں شمشیر سنگھ سندھو بھی تھا جو بعد میں پنجابی فلموں کا مشہور گیت کار بنا۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ 1972ء میں ریاستی اسمبلی کے سابقہ سپیکر اور بعد ازاں گورنمنٹ سروس میں سیکریٹری صنعت وحرفت کے عہدے پر کام کرنے والے ادب نواز جناب غلام رسول رینزو نے جموں میں کُل ہند اُردو کانفرنس کروائی۔ جس میں اُردو ادب کے جگمگاتے ستارے شامل ہوئے۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، مجروح سلطان پوری، بیکل اُتساہی، انور مرزا پوری، پریم دھون، رامانند ساگر، واجدہ تبسم وغیرہ کی شرکت نے اُس کانفرنس کی افادیت کو معتبر بنایا۔ محفل افسانہ میں جو خواجہ احمد عباس کی صدارت میں ہوا اور جس میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم وغیرہ نے اپنے افسانے پڑھے۔ وہاں خالد حسین نے ''ٹھنڈی کانگڑی'' افسانہ پڑھا۔ اُس کانفرنس کی رُوداد اور کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات، افسانے، غزلیں اور نظمیں وغیرہ شاہد بڈگامی نے کتابی صورت میں چھاپ کر اُن تاریخی واقعات کو محفوظ کر لیا تھا۔ خالد حسین کی دوسری پنجابی کہانی ''مائے نی میں کینوں آکھاں'' اور پھر تیسری اور چوتھی کہانیاں بھی امرتا پریتم جی نے ''ناگ منی'' میں چھاپ کر خالد حسین کو پنجابی کا ایک افسانہ نگار بنا دیا۔ اُنہوں نے خالد حسین کا ایک انٹرویو بھی اپنے جریدے میں چھاپا جو بعد ازاں اُنہوں نے ہندی کے مشہور رسالے ''سوریہ انڈیا'' میں بھی چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ بس پھر خالد حسین نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ تیزی سے افسانے لکھنے لگا۔ پنجابی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی۔ جو افسانہ وہ پنجابی میں لکھتا، اُس کا اُردو ترجمہ کِسی اُردو جریدے کو بھیج دیتا۔ اِسی طرح جو افسانہ وہ اُردو میں لکھتا، اُس کا پنجابی ترجمہ پنجابی میگزین

میں چھپنے کے لئے بھیج دیتا۔ یوں خالد حسین کے افسانے پنجابی اور اُردو میں تواتر کے ساتھ چھپنے لگے ۔ وہ پنجابی پاٹھکوں میں ایک جانا پہچانا نام بن گیا۔ اُس پر مضامین لکھے جانے لگے۔ ''ناگ منی'' کے علاوہ پنجاب اور دہلی سے نکلنے والے جرائد نیل منی، سیدھ، ساہت کار، عکس، پنجابی ڈائجسٹ، پریرنا، لَو، اکھر، پریت لڑی، پروچن، سمدرشی، ترشنکو اور بے شمار پنجابی میگزینوں میں وہ لگاتار چھپتا رہا۔ پاکستانی پنجاب کے پنجابی جرائد پنج دریا، سورج مُکھی، پنچم، لہراں، انٹرنیشنل سویر، پنج رنگ، وارث شاہ، سنگری، پنجابی ادب، رویل اور کئی دیگر رسالے۔ جبکہ اُردو میں شب خُون، شمع، آجکل، سطُور، الفاظ، اوراق، تحریکِ ادب، لمحے لمحے، ادبِ لطیف، بدلتی دُنیا، سائبان، قومی ڈائجسٹ، شاعر، سب رس، روبی، نگینہ اور کئی دوسرے رسالوں میں اُس کے افسانے چھپتے رہے۔ اُس نے تقریباً تمام کُل ہند اور ہند۔ پاک پنجابی ادبی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ ورلڈ پنجابی کانگریس، بابا فرید امن مشن، بابا نانک امن کانفرنس وغیرہ کیلئے وہ آٹھ نو بار پاکستان گیا۔

بقول خالد حسین یہ غالباً 1971ء کے دسمبر مہینے کی بات ہے، جب وہ ایک ادبی کانفرنس میں شمولیت کے لئے جالندھر گیا۔ وہاں اُس نے اپنا پنجابی افسانہ ''دھرتی روندی اے'' پڑھا۔ محفلِ افسانہ کی صدارت مشہور ادیب اور فلم ایکٹر بلراج ساہنی کر رہے تھے۔ جن سے وہ سری نگر اور جموں میں پہلے ہی مِل چُکا تھا۔ افسانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر کیا گیا تھا۔ افسانہ سُننے کے بعد کئی دوستوں نے اپنی رائے دی لیکن بلراج ساہنی صاحب خاموش رہے۔ تقریب ختم ہونے کے بعد بلراج ساہنی جی خالد حسین کو ساتھ لے کر ہوٹل ''سکائی لارک'' میں لے گئے، جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے کافی منگوائی اور پھر خالد کی کہانی پر بولنے لگے۔ اُنہوں نے کہا۔

''ویسے تو تمہاری کہانی ہر پہلو سے ایک اچھی کوشش کہی جاسکتی ہے لیکن تم نے کہانی میں ایک خاص فرقے کی حالتِ زار کی تصویر دِکھائی ہے۔ یوں یہ کہانی صرف مُسلم طبقے کے ساتھ جُڑ گئی ہے۔ جب کہ ہندوستان میں ہر مذہب کے ماننے والوں میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جنکی حالت مسلم طبقے سے بھی زیادہ خراب ہے۔ کیا دوسری اقلیتیں یہاں زیادہ محفوظ ہیں؟ کیا اُن کے ساتھ ظلم روا نہیں رکھا جارہا؟ کیا دلت (شُودر) عیسائی، آدی واسی اور دیگر غریب طبقوں کو دووقت کی روٹی میسر ہے۔ اُن کے پاس رہنے کو چھت ہے؟ پہننے کو کپڑا ہے؟ نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔ دُنیا میں دو ہی مذہب ہیں۔ ایک امیری کا اور دوسرا غریبی کا۔ میں مانتا ہوں کہ سیاسی مفاد پرستوں اور مذہبی ٹھیکیداروں کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں سے ہتک آمیز سلوک کیا جاتا ہے اور یہ ہر میدان میں

پچھڑ رہے ہیں لیکن مسلم سماج یا ہندو سماج کو مرکزی نقطہ بنا کر کہانی لکھنا ایک ادیب کیلئے مناسب نہیں۔ ادب یونیورسل ہونا چاہیئے ۔اُسکی تخلیق میں اتنادم ہونا چاہیئے کہ فلسطین میں رہنے والا کہانی پڑھ کر اُسے اپنی رُوداد مانے۔ ویت نام والا کہے کہ یہ اُسکا المیہ بیان کیا گیا ہے ۔غرض دُنیا کے ہر مظلوم کو کہانی میں اپنا چہرہ دِکھائی دینا چاہیئے ۔ایک ادیب کو کسی خاص دھرم ،فرقے یا عقیدے سے جُڑ کر کبھی ادب تحریر نہیں کرنا چاہیئے''۔

ممبئ پہنچ کر بلراج ساہنی جی نے خالد حسین کو پنجابی زبان اور ادب کے حوالے سے تین خطوط لکھے جو اُس کے پاس محفوظ تھے۔اُن خطوط میں بلراج جی نے اپنا نظریہ بیان کرنے کے علاوہ اچھا ادیب بننے کے لئے بڑھیا مشورے بھی دیئے تھے ۔اُس کے بعد خالد حسین نے کبھی کوئی ایسا افسانہ نہیں لکھا جس میں کسی خاص مذہب،فرقے ،ذات برادری کی طرف جھُکاؤ ہو۔1975 میں خالد حسین پنجابی ساہت سبھا سری نگر کا صدر منتخب ہوا۔اُس وقت اُس کی عمر تیس سال تھی اور اُس وقت تک خالد حسین کی پنجابی میں پچاس سے زائد کہانیاں چھپ چکی تھیں اور پنجابی ادبی دُنیا،کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اُسکو سب جانتے تھے۔صدر بنتے ہی اُس نے فیصلہ لیا کہ سری نگر میں دوروزہ پنجابی ادبی کانفرنس کرائی جائے۔سینئر ممبران نے اس تجویز سے اختلاف کیا لیکن ہربھجن سنگھ ساگر اور اوتار سنگھ چندن خالد کے ساتھ جُڑ گئے۔پھر کانفرنس کے سلسلہ میں کام شُروع ہوا۔خالد حسین امرتسر،جالندھر اور کئی دوسرے شہروں میں گیا اور کانفرنس کو کامیاب بنانے کیلئے ادب نوازوں کو شرکت کا دعوت نامہ دیا۔روزانہ ''اجیت'' جالندھر کے مُدیر اعلیٰ ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدرد نے مالی مدد بھی کی اور پانچ ہزار روپے دیئے نیز گورودوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر کے صدر گورچرن سنگھ ٹوہرہ کے نام مالی امداد کیلئے خط لکھ کر دیا۔ٹوہرہ صاحب نے بھی پانچ ہزار روپے دیئے ۔کانفرنس کی تاریخ مقرر کی گئی اور پھر سات ۔آٹھ جولائی 1975 کو سری نگر کے ٹیگور ہال میں دوروزہ پنجابی ادبی کانفرنس کا انعقاد ہوا ۔خالد حسین کے ذاتی تعلقات کی وجہ سے کانفرنس میں تقریباً اڑھائی سو دانشوروں ، ادیبوں،شاعروں ،کالج اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں نے شرکت کی ۔جن میں پروفیسر وشوانا تھ تیواڑی ( کانگریس کے منیش تیواڑی کے والد)، ڈاکٹر عطر سنگھ، پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں ، ڈاکٹر ایس،ایس اہلووالیا، پروفیسر ہرنام سنگھ شان،ڈاکٹر گلونت سنگھ،ڈاکٹر سوہن سنگھ شیتل،ڈاکٹر ہربھجن سنگھ ، ڈاکٹر کرنیل سنگھ تھند،ڈاکٹر امریک سنگھ پُونی ( آئی ،اے ،ایس ) ،ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدرد، ڈاکٹر دھرم پال سِنگل ، ڈاکٹر رگھبیر سنگھ سرجنا کے نام اہم ہیں۔اس کے علاوہ وریام سندھو،جسونت

کنول ،مختار گل ،گُل چوہان ڈاکٹر کرنیل سنگھ شیر گل، پرمندر جیت ،جسونت سنگھ وردی، پاش، امیتوج ،چندن نیگی ، جوگندر کیروں ، ہربھجن باجوہ اور بے شمار افسانہ نگار ، ناول نگار اور شاعر بھی تشریف لائے ۔کانفرنس کی صدارت وزیر اعلیٰ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پنجاب کے چیف منسٹر گیانی ذیل سنگھ نے شرکت فرمائی۔اُنکے ساتھ پنجابی کے اُستاد شاعر اور سابقہ وزیر اعلیٰ پنجاب گیانی گُورمُکھ سنگھ مسافر اور پنجاب کے وزیر تعلیم بھی تشریف لائے ۔شیخ محمد عبداللہ کی کابینہ کے سبھی وزراء نے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کی حالانکہ اُن دِنوں اسمبلی کا سیشن چل رہا تھا ۔جموں کشمیر کے وزیر تعلیم سردار رنگیل سنگھ جی نے بھی سبھی مہمانوں کو امرسنگھ کلب میں عشائیہ دیا جس میں دونوں وزرائے اعلیٰ نے شرکت کی اور جموں وکشمیر اور پنجاب کے باہمی امور پر تبادلۂ خیال کیا۔نارتھ زون کلچرل سنٹر پٹیالہ اور دیگر تنظیموں کی طرف سے رنگارنگ تمدنی پروگرام پیش کیا گیا۔اُن دِنوں ملک میں ایمرجنسی لگی ہوئی تھی ۔اور سری نگر میں منعقدہ پنجابی ادبی کانفرنس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے گیانی ذیل سنگھ جی کے دو وزراء نے روزنامہ ''اجیت'' کے چیف ایڈیٹر سادھو سنگھ ہمدرد جی کو یہ تجویز دی کہ کانفرنس کے دوران کیوں نہ ایمرجنسی کے حق میں قرارداد منظور کرالی جائے ۔خالد حسین کو اس بات کا کوئی علم نہیں تھا کہ اس ادبی کانفرنس کو سیاست کے لئے بھی استعمال کیا جائے گا لیکن اُسے مشہور شاعر ''پاش'' نے بتایا کہ گیانی ذیل کے چمچے ایمرجنسی کے حق میں قرارداد پاس کروانے جا رہے ہیں۔اگر ایسی کوقرارداد لائی گئی تو وہ اُسکی سخت مخالفت کریں گے اور کانفرنس میں کھلبلی مچے گی ،اُس کے لئے وہ اور اُسکے ساتھی ادیب ذمہ دار نہیں ہوں گے ۔خالد حسین نے ساری بات ڈاکٹر عطر سنگھ ،ڈاکٹر وشوامتر تیواڑی اور سادھو سنگھ ہمدرد کو بتائی اور یہ بھی کہا کہ شیخ محمد عبداللہ بھی ایمرجنسی کے سخت خلاف ہیں۔لہذا اگر اس قسم کی قرارداد منظور کرائی گئی تو خالد حسین کی نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے ۔ان سبھی دانشوروں نے انتہائی خوش اسلوبی سے اس معاملہ کو سُلجھایا اور ایمرجنسی والی قرارداد پیش نہیں ہونے دی۔اس کانفرنس کی وجہ سے جموں یونیورسٹی میں بابا فرید چیئر دینے کا اعلان گیانی ذیل سنگھ جی نے کیا۔ پنجابی کے مشہور ناول نویس اور ہندی فلم ''پوتر پاپی'' کے لیکھک نانک سنگھ کے بیٹے ڈاکٹر کرتار سنگھ سُوری کو ہیڈ بنایا گیا۔بعد ازاں یہ چیئر پنجابی شعبہ میں تبدیل ہوئی ۔گیانی جی نے پنجابی ساہت سبھا سری نگر کو مالی امداد بھی دی۔ چندن نیگی کا ادبی سفر بھی اِسی کانفرنس میں کہانی پڑھنے سے شروع ہوا۔اس تاریخی کانفرنس کو ناکام کرنے کیلئے مقامی پنجابی ادبی مافیا اور ساہت سبھا کے پُرانے چوہدریوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ سبھا اُنکے ہاتھ سے ہمیشہ کیلئے نکل جائے۔

اُنہوں نے تاراور ٹیلیفون کے ذریعے ہمدردؔ صاحب، ڈاکٹر عطر سنگھ اور کئی دوسرے معتبر صحافیوں اور ادیبوں سے کہا کہ کانفرنس ملتوی کر دی گئی ہے۔ لہٰذا کوئی بھی سری نگر نہ آئے کیونکہ یہاں حالات خراب ہیں۔ ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدرد نے خالد حسین سے ٹیلیفون پر رابطہ کیا اور پوچھا کہ کیا کانفرنس کینسل کر دی گئی ہے۔ جب خالد حسین نے کہا کہ بالکل نہیں۔ بلکہ یہ اُنکے مخالفوں کی سازش ہے تو ہمدرد صاحب نے لگاتار چار، پانچ ایڈیٹوریل کانفرنس کے حوالے سے لکھے اور اُس میں شمولیت کو یقینی بنانے کے لئے کہا۔ کانفرنس کی مخالفت کرنے والوں میں کنول کشمیری، گورچرن سنگھ گلشن، سیوا سنگھ اور پریم سنگھ پیش پیش تھے۔ اُنھیں اس بات کا دُکھ تھا کہ ایک مُسلا ہمارے بغیر کیسے یہ کانفرنس کرا سکتا ہے۔ اِن لوگوں کے سارے ہتھکنڈے ناکام ہوئے تو کانفرنس سے ایک دِن پہلے یہ لوگ دفتر میں آ کر کہنے لگے ''پچھلی باتوں کو بھلا دُو اور ہمیں کانفرنس کی ذمے داری سونپو۔ پروفیسر پریم سنگھ سٹیج سنبھال لے گا۔ مہمانوں کے سواگت کے لئے سیوا سنگھ اور سرن سنگھ ہیں۔ تم فِکر نہ کرو، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ پنجابی زبان اور ادب کی ترقی ہم سب کا مقصد ہے۔ لہٰذا ہم کام بانٹ لیتے ہیں''۔ خالد حسین نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ یہ دوغلا پن چھوڑیں اور شرارتیں کرنا بند کر دیں۔ سٹیج ہر بھجن سنگھ ساگر سنبھالے گا جس نے رات دِن کام کیا ہے۔ آپ لوگ صرف کانفرنس میں شرکت کریں۔ یہی کافی ہے''۔ اس کانفرنس کیلئے خالد حسین، اوتار سنگھ چندن اور ہر بھجن سنگھ ساگر گوردواروں، دُوکانوں اور پنجابی گھروں میں چندہ اکٹھا کرتے رہے۔ مہمانوں کو ٹھہرانے کیلئے سری نگر میں مقیم پنجابی بھائیوں سے التجا کی گئی کہ وہ دو دو مہمانوں کو اپنے ہاں ٹھہرائیں۔ الغرض کانفرنس کی کامیابی پر سب خوش تھے اور خالد حسین نے شُکرانے کے نفل پڑھے کہ اللہ نے عزّت رکھ لی۔ لیکن اِس ادبی مافیا کی گھٹیا سوچ کا اندازہ آپ اِس بات سے لگائیں کہ کانفرنس سے متعلق فائلیں، فوٹو البم، حساب کتاب کا رجسٹر، خطوط اور دیگر متعلقہ ریکارڈ ساہت سبھا کے دفتر سے ہی غائب کر دیا گیا۔ تاکہ اس تاریخ ساز کانفرنس کی حصولیابی کا سہرا خالد حسین کے سر نہ باندھا جا سکے۔ یہ باتیں سناتے ہوئے خالد حسین اکثر جذباتی ہو جاتا تھا۔

جموں میں رہائش کے دوران خالد حسین اکثر پنجابی لیکھک سبھا جموں کی ادبی مجالس میں حِصہ لیتا۔ ایک بار پروفیسر بھوپندر سنگھ سُودن کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ بھوپندر سنگھ سُودن خالد حسین کا دوست تھا اور خالد نے اُس کے پہلے افسانوی مجموعے کا پیش لفظ بھی لکھا تھا۔ خالد حسین نے جب اپنی رائے رکھی تو وہاں بیٹھے سُودن کے ایک نام نہاد حمایتی نے خالد حسین پر کُرسی دے ماری

۔کُرسی خالد کو نہیں لگی لیکن وہاں بیٹھے کسی نے بھی احتجاج نہیں کیا بلکہ سب خاموش رہے ۔جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔خالد حسین خاموشی سے اُٹھا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔کسی نے اُسے روکا بھی نہیں ۔صرف کہانی کار اِچھو پال باہر آیا اور معافی مانگنے لگا لیکن معافی تو سبھا کے صدر اور ممبران نے مانگنی چاہیئے تھی پھر اُسکے بعد خالد حسین نے کبھی لیکھک سبھا کے دفتر میں قدم نہیں رکھا۔فرداً فرداً سبھی اُس کے پاس معافی مانگنے آئے ۔ یہاں تک کہ مہندر سنگھ رنجُو بھی اُسکے گھر آیا اور ہاتھ جوڑ کر اپنے کئے پر معافی مانگنے لگا لیکن بحیثیت مجموعی سبھا نے معذرت نہیں کی ۔ چنانچہ اُس کے بعد خالد کبھی وہاں نہیں گیا۔ 2010ء میں نئے صدر شمشیر سنگھ چوہالوی نے بحیثیت صدر معافی نامہ لکھ کر دیا اور گذارش کی کہ وہ سبھا کی میٹنگوں میں آئے لیکن وہ نہیں گیا۔البتہ سبھا کا دفتر بنانے کیلئے اُس سے جتنی مدد ہوسکی وہ اُس نے کی ۔ پھر اُس نے اپنے دوست ہربھجن سنگھ ساگر،سوشیل شرما اور سرن سنگھ کے ساتھ مِل کر ایک نئی ادبی جماعت بنائی اور نام رکھا ''پنجابی ادبی سنگت''جس نے جموں میں کئی ادبی پروگرام کرائے ۔

یہ شاید 1979ء کی بات ہے کہ خالد حسین نے اپنی نئی پنجابی کہانی ''بیڈے دی لنکا'' پنجابی ساہت سبھا سری نگر کے دفتر میں پڑھی ۔محفلِ افسانہ کی صدارت نامور اُردو شاعر،نقاد اور ادیب جناب علی سردار جعفری کر رہے تھے ۔ساہت سبھا کے مہارتھیوں نے افسانے کی دھجیاں اُڑا دیں اور اُسے افسانہ ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ جب محفلِ افسانہ کے صدر جناب علی سردار جعفری نے صدارتی کلمات فرمائے تو اُنہوں نے خالد حسین کے افسانہ کی بہت تعریف کی اور افسانے کا تقابلی جائزہ بیدی اور کرشن چندر کی کہانیوں سے کیا۔انہوں نے خالد حسین سے کہا کہ وہ اس افسانے کا اُردو ترجمہ کرے اور اُنھیں دے تا کہ وہ اسے اپنے ماہنامہ ''گفتگو''میں چھاپ سکیں۔علی سردار جعفری صاحب سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے اور دوسرے دِن اُنکی ممبئی کے لئے فلائٹ تھی۔خالد حسین نے رات دو بجے تک افسانے کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ پھر کاربن رکھ کر اُسے صاف صاف لکھا۔ اتنے میں صبح ہوگئی تھی۔اُس نے نہادھو کر کپڑے پہنے اور سرکٹ ہاؤس چلا گیا۔جعفری صاحب بریک فاسٹ کر رہے تھے۔اُنہوں نے خالد حسین کو بھی ناشتے میں شامل کیا۔پھر اُردو ترجمہ سنا۔خالد حسین نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور واپس تُلسی باغ اپنے سرکاری کوارٹر میں آ گیا۔دو مہینے بعد خالد حسین کو گفتگو جریدے کی کاپی ڈاک کے ذریعہ ملی جس میں اس کا افسانہ ''بیڈے کی لنکا'' کے عنوان سے چھپا تھا۔شمارہ اکتوبر 1979ء کا تھا۔یہی افسانہ لاہور سے شائع ہونے والی پنجابی میگزین ''لہراں'' میں بھی چھپا تھا اور امرتسر سے نکلنے والے جریدے ''ساہتکار'' میں بھی چھپا تھا۔پھر فروری

1980ء میں اس کہانی کا انگریزی ترجمہ ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' میں چھپا۔ جس کا ترجمہ مشہور انگریزی ادیب ،صحافی اورالسٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (ممبئی) کے مُدیر جناب خشونت سنگھ نے کیا تھا اور فُٹ نوٹ میں لکھا تھا، ''Courtesy from Guftugoo''۔ یعنی کہانی پنجابی میں لکھی گئی۔ پھر اُسکا ترجمہ خالد حسین نے اُردو میں کیا اور وہاں سے انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ یہ وہی کہانی ہے جس کو پنجابی ساہت سبھا کے مافیا گروپ نے یکسر مسترد کر دیا تھا۔ یہ کہانی خالد حسین کے دوسرے پنجابی افسانوں مجموعے ''گوری فصل دے سوداگر'' میں درج ہے اور اُردو کے افسانوی مجموعے ''اشتہاروں والی حویلی'' میں شامل ہے۔ خالد حسین کے ایک شرارتی دوست نے نمک مرچ لگا کے یہ کہانی اُستاد محلے کے اُن کرداروں کو سُنائی جن کے اِردگرد کہانی بُنی گئی تھی۔ کیونکہ اُن کے نام افسانے کے کرداروں کے ساتھ ملتے جُلتے تھے۔ اس لئے کچھ لوگوں نے خالد حسین کے خلاف عدالت میں جانے کا فیصلہ کیا۔ کُچھ لوگ خالد کے گھر کے باہر گالی گلوچ بھی کرتے۔ آخر محلے کی کُچھ معتبر شخصیات اور خالد حسین کے کچھ دوستوں نے اُن لوگوں کو سمجھا بُجھا کر معاملہ رفع دفع کروادیا۔ پنجابی میں خالد حسین کا پہلا افسانوی مجموعہ 1976ء میں چھپا جس کا عنوان تھا ''تے جہلم وگدا رہیا''۔ دوسرا افسانوی مجموعہ ''گوری فصل دے سوداگر'' 1981ء میں اور پنجابی کہانیوں کی تیسری کتاب ''ڈونگھے پانیاں داڈُکھ'' 1988ء میں چھپی جبکہ کہانیوں کی چوتھی کتاب ''بلدی برف دا سیک'' 2005ء میں پانچویں کتاب ''سُولاں دا سالن'' 2015ء میں چھپی اور چھٹا پنجابی افسانوی مجموعہ ''عشق ملنگنی'' 2019ء میں منظر عام پر آیا۔ اِن افسانوی مجموعوں کے علاوہ خالد حسین نے پنجابی میں اپنی سوانح حیات ''ماٹی کُدم کریندی یار'' 2013ء میں چھپوائی۔ غیر مسلم بچوں کیلئے آنحضرتؐ کی بائیوگرافی ''نوری رِشماں'' 2004ء میں۔ مضامین کا مجموعہ ''میرے رنگ دے اکھر'' 2013ء اور ایک ناولٹ ''گواچی جھانجر دی چیک'' 2010ء میں پبلش کروایا۔

اُردو زبان میں خالد حسین کے چار افسانوی مجموعے چھپ چُکے ہیں۔ جن کے نام ہیں۔
1۔ ٹھنڈی کانگڑی کا دُھواں (1981ء) ۔2۔ اشتہاروں والی حویلی (1991ء) ۔ 3۔ ستی سرکا سورج (2011ء) اور جنّت گرہن (2021ء)۔ خالد حسین کے کئی افسانوں کا ترجمہ ہندی، بنگالی، ملیالم، تمل، ڈوگری، کشمیری اور انگریزی میں ہو چُکا ہے۔ اُس کی کہانیوں کا ہندی ترجمہ ڈاکٹر کیرتی کیسر، سردار پنچھی، یوگیتا یادو، دیس راج کالی، اگنی شیکھر وغیرہ نے کیا ہے اور ہندی میں یہ کہانیاں ''بھاشا''، ''سمکالین بھارتی ساہت''، ''دینک جاگرن''، ''دینک بھاسکر''، ''دینک

ٹربیون'' اور ''امراُجالا''، ''پنجاب کیسری'' اور دیگر کئی میگزینوں میں چھپ چکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔خالد حسین کی کہانیوں کا ہندی انتخاب ''گھر میں ہے بیراگ'' کے نام سے 2017ء میں چھپا تھا جس میں اُس کی 41 کہانیاں درج ہیں اور مترجم کا نام دیپک آرسی ہے۔خوشونت سنگھ کے علاوہ ڈاکٹر للت گپتا، آدرش اجیت، مشتاق برق، شفیع احمد کے علاوہ دو چار دوسرے لوگوں نے بھی خالد حسین کی کہانیوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔اُس کی ایک کہانی ''لکیر'' پر پہلی پوٹھواری فلم بنی ہے جس نے سلور جوبلی منائی تھی۔اُس کی دو کہانیوں پر مشتمل ڈرامہ ''عشق ملنگی'' مشہور تھیٹر ڈائریکٹر مشتاق کاک نے ملک کے 12 بڑے شہروں میں اسٹیج پر کھیلا ہے جن میں کلکتہ، میسور، حیدرآباد، میرٹھ، امرتسر، بنگلور، چنئی اور بھوپال قابل ذکر ہیں۔نئی دہلی میں یہ ڈرامہ نیشنل سکول آف ڈرامہ کی طرف سے کھیلا گیا۔خالد حسین کا افسانوی سفر تقریباً پچاس سال پر محیط ہے۔اُس کے بے شمار انٹرویو ہندوستان اور پاکستان کے مشہور ٹیلی ویژن چینلوں اور ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔اُسکے افسانوں پر پنجابی کے نامور تنقید نگاروں نے پیپر لکھے ہیں جن میں ڈاکٹر نجن تسنیم، ڈاکٹر ستندر سنگھ نُور، ڈاکٹر منموہن، ڈاکٹر سی، آر، مودگل، ڈاکٹر جگبیر سنگھ، ڈاکٹر جوگندر راہی، ڈاکٹر کرمجیت سنگھ، ڈاکٹر گورپال سنگھ سندھو، ڈاکٹر سُکھدیو سنگھ، ڈاکٹر روندر کمار، ڈاکٹر دیویندر کور، ڈاکٹر ہرمندر کور، پرتپال سنگھ بیتابؔ، فخر زماں، پروین ملک، ڈاکٹر سعید بھٹا، نین سُکھ، اقبال قیصرؔ وغیرہ اہم نام ہیں۔یہ تنقیدی مضامین کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ہیں اور کتاب کا نام ہے۔''خالد حسین دا کتھا جگت'' خالد حسین کی کئی کہانیاں بی، اے اور ایم، اے (پنجابی) کلاسوں کے نصاب کا حِصہ بنتی رہی ہیں۔ تقریباً سبھی یونیورسٹیوں میں اُس پر کام ہوتا رہا ہے۔ابھی تک اُس پر گیارہ ایم، فِل اور ایک پی، ایچ، ڈی ہو چکی ہے۔اُردو افسانوی مجموعے ''ٹھنڈی کانگڑی کا دُھواں''، ''اشتہاروں والی حویلی'' اور ''ستی سرکا سورج'' پر جموں یونیورسٹی، حیدرآباد یونیورسٹی اور سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد میں ایم فِل ہو چکا ہے جبکہ ''جنّت گرہن'' پر جموں یونیورسٹی کا ایک اسکالر ایم فِل کر رہا ہے۔وہ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی میں پنجابی ایڈوائزری بورڈ کا پانچ سال تک ممبر رہا۔ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی Standing Committee کا بھی ممبر رہا اور بابا فریدؔ صوفی فاؤنڈیشن سے بھی وابستہ رہا۔ پاکستان اور ہندوستان کے کئی ادبی اداروں کی جانب سے اُسکی عزت افزائی کی گئی۔''پریس کلب لاہور'' مسعود کھدر پوش ٹرسٹ لاہور، سٹی زن کونسل میر پور، ورلڈ پنجابی کانگرس لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور وغیرہ اور بھارت میں پنجاب سرکار کی طرف سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ۔(شرومنی پنجابی

ساہتکار) سے نوازا جاچکا ہے۔جس میں خلعت فاخرہ کے علاوہ پانچ لاکھ کی رقم بھی شامل تھی۔اس کے علاوہ پنجاب سرکار کی طرف سے ''پنجاب رتن'' کا ایوارڈ، کیندری لیکھک سبھا چندی گڑھ، پنجابی ساہت اکادمی لُدھیانہ، ''قلم'' پھگواڑہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی گولڈن جوبلی کے موقعہ پر Outstanding پنجابی رائٹر کا ایوارڈ کے علاوہ کئی دیگر انعامات جن کی لسٹ بڑی لمبی ہے۔

خالد حسین کی کہانیوں کے موضوع، ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ تہذیب وتمدن اور آپسی بھائی چارہ، ملک کی تقسیم کے زخم، جموں وکشمیر کی سیاست، 1990ء کے بعد ریاستی عوام کے مسائل بے بسی اور بے کسی کے حالات، سماج میں عورت کی حالت وغیرہ ہیں۔خالد حسین کے افسانوں کے بارے میں چند مشہور ناقدین اور ادیبوں کی آرا پیش کررہا ہوں۔

''خالد حسین کے افسانے وسیع مطالعے، تجربے اور مشاہدے کی دلیل ہیں۔اُسکی کہانیوں میں تواریخ، سماجیات اور سیاسیات کا ایک پورا منظر نامہ ملتا ہے''۔فخر زماں (ناول نگار۔شاعر) سابقہ چیئرمین پاکستان اکادمی آف لیٹرز''خالد حسین کے افسانوں میں علامتی لہجہ، الفاظ کی تہذیب اور فنی رموز پر دسترس، اُسکی خصوصیت ہے۔(ڈاکٹر ستیندر سنگھ نُور، سابقہ نائب صدر، ساہتیہ اکادمی، دِہلی)۔

خالد حسین اپنے تخلیقی عمل میں نہ کسی مذہب سے وابستہ ہوتے ہیں اور نہ کسی ملک سے۔جغرافیائی حدیں اور سرحدیں اُن کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔(وریام سندھو۔افسانہ نگار)

خالد حسین اپنے موضوعات کا شعوری انتخاب کرتے ہیں اور گردوپیش کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے تضادات کو شدّت سے محسوس کرتے ہیں اور اسی سے افسانہ لکھنے کی تحریک پاتے ہیں۔(ڈاکٹر حامدی کشمیری (نقاد) سابقہ وائس چانسلر۔کشمیر یونیورسٹی)

خالد حسین کے افسانوں میں زبان کے استعمال کا کمال دیکھنے کو ملتا ہے۔اُس کے بیشتر افسانے دِلوں کی دُوریاں مٹانے کی طاقت رکھتے ہیں۔(ڈاکٹر للت مگوترا۔افسانہ نگار)

خالد حسین کی کہانیوں میں شبدشکتی، انسان اور انسانیت کے تئیں اُسکی ادبی ذمہ داری کا برملا اظہار ملتا ہے۔وہ مشرقی اور مغربی پنجاب کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

(ڈاکٹر اگنی شیکھر۔ہندی افسانہ نگار اور شاعر)

خالد کو جب ملتا ہوں تو اُسکا اپنا پن، دلچسپ باتیں، لطیفے ایک ایسا عالم طاری کرتے ہیں کہ اپنی دُنیا اور اپنا آپ اچھا لگنے لگتا ہے۔اُس کے افسانے پڑھتا ہوں تو اُسکی بامحاورہ چٹخاری زبان اور کہانی پن، جاندار کردار اور بیان کا جادُو دِل کو موہ لیتا ہے۔مجھے وہ مشرقی اور مغربی پنجاب کے

درمیان بیٹھا ایک ایسا درویش لگتا ہے جو پانچ دریاؤں کی لہروں کا ترجمہ کر رہا ہے ۔ (ڈاکٹر سُرجیت پاتر۔ پنجابی شاعر)

خالد حسین کی کہانیوں میں ایک ایسی دُنیا آباد ہے جو اُسکی نصف صدی کے ذہنی سفر کی غماز ہے ۔ وہ ایک سچا ادیب ہے۔ اُس نے بڑی ایمانداری سے دُنیا کو ایسا آئینہ دِکھایا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔

(ویدراہی۔ اُردو، ڈوگری افسانہ نگار۔ فلم ساز اور ہدایت کار۔ ممبئی)

خالد حسین کے افسانے بیک وقت مفاہمت اور مزاحمت دونوں کا رشتہ نبھاتے ہیں ۔ اُس نے ایمانداری کے ساتھ اپنے ماحول اور معاشرہ کی سچائیوں کو بیان کیا ہے۔

(پروفیسر قدوس جاوید۔ سابقہ صدر، شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی)

خالد حسین صاحب ایک فطری، معتبر اور کُہنہ مشق تخلیق کار ہیں۔ اُنکو اپنے فن پر کامل گرفت اور مہارت حاصل ہے۔ اُنکی کہانیاں مدتوں دِل و دِماغ پر چھائی رہتی ہیں۔ کہانیوں میں اُردوئے مُعلیٰ کی شیریں اور سادہ زبان ہے۔ پنجابی محاورے اور اُردو کی ضرب المثلیں ہیں جو کہانی کے دسترخوان کو خوش ذائقہ اور خوش رنگ بنا دیتی ہیں۔

(سید تقی عابدی (ڈاکٹر)۔ نقاد۔ ٹورنٹو، کنیڈا)

خالد حسین کی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے دو باتوں کا شدّت سے احساس ہوا۔ پہلی، اُسکی کہانیوں میں کہانی پن کا مضبوط اظہار اور دوسری اُسکی زبان کی خوبصورتی۔ اُس کا بیانیہ اور منفرد اسلُوب اُس کی خوبی بھی ہے اور شناخت بھی۔ (منموہن (ڈاکٹر) پنجابی نقاد، ناول نگار اور شاعر دوارکا۔ نئی دہلی)

میں نے بھی اپنے ایک مضمون میں خالد حسین کے فن کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ کہا ہے ۔''خالد حسین اپنی کہانیوں کا مواد زمین کی کھُردری سطح اور اردگرد کے ماحول سے حاصل کرتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اُسکی کہانیوں میں جہاں حُسن و جمال اور پیار محبت کی نزاکتیں ملتی ہیں وہاں موجودہ پُرآشوب دور کی تصویریں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ تصویریں ضرور بدصورت ہیں لیکن خالد حسین اِس بدصورتی کو خوبصورتی میں تبدیل کرنے کا خواہاں ہے۔ (نور شاہ۔ افسانہ نگار)

2004 میں پنجابی ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا ایک وفد اُس وقت کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ کیپٹن امریندر سنگھ کی سربراہی میں ورلڈ پنجابی کانفرنس میں شمولیت کیلئے لاہور گیا۔ اُس وفد میں جموں و کشمیر کی نمائندگی خالد حسین نے کی تھی۔ خالد حسین کے ساتھ اُسکے دوست پرنسپل اوتار سنگھ سِدھو اور بیبا بلونت شاہ تاج ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے تھے۔ دوسرے دِن

کانفرنس پانچ تارہ ہوٹل ''فلیٹی'' کے کانفرنس ہال میں شروع ہوئی ۔ اسٹیج پر پاکستانی پنجاب کے وزیراعلیٰ پرویز الٰہی، بھارتی پنجاب کے چیف منسٹر کیپٹن امریندر سنگھ، دونوں پنجابوں کے وزرائے تعلیم وثقافت اورورلڈ پنجابی کانگرس کے چیئرمین اورسابقہ وزیرجناب فخرزماں بیٹھے تھے جومشہورناول نگاراورشاعرہیں۔ فخرزمان صاحب جب استقبالیہ خطبہ پڑھ رہے تھے تو پرنسپل اوتارسنگھ سِدھونے ایک پرچی پرلکھا کہ اُسے منٹگمری جانے کی اجازت دی جائے جہاں وہ موضع گریجویٹ چک میں پیدا ہوا تھا وہ وہاں جانا چاہتا ہے تا کہ اپنے گھر کو دیکھے اور وہاں کی مٹی لائے۔ پرچی اُس نے جا کر پرویز الٰہی صاحب کو دی۔ اُنہوں نے پرچی پڑھی اور اپنے پاس رکھ لی۔ جب وہ صدارتی کلمات کہنے کے لئے اُٹھے تو اُنہوں نے سب سے پہلے اوتارسنگھ سِدھو سے مخاطب ہو کر کہا کہ کِسی سِدھو صاحب نے مجھے یہ پرچی دی ہے اور منٹگمری جانے کی اجازت مانگی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ لارڈ منٹگمری اور باقی سارے انگریز برصغیر ہندو پاک سے کب کے جا چکے ہیں۔ اسلئے ہم نے یہاں کے رہنے والے ساہی جٹوں کے نام پر منٹگمری کا نام ساہیوال رکھا ہے۔ اُنہوں نے فراخ دِلی کے ساتھ محکمہ سیاحت کے ڈائریکٹر کو حکم دیا کہ وہ انھیں ساہیوال جانے کیلئے سرکاری کار دیں۔ دوسری صبح اوتارسنگھ سِدھو، بیبا بلونت اور خالد حسین ساہیوال کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ سب کو پیاس لگی ہوئی تھی۔ جب کارواں کاڑہ پہونچی تو ڈرائیور سے رُکنے کیلئے کہا گیا۔ وہ تینوں کار سے نیچے اُترے اور ایک پھل فروش سے کِنُو کا جُوس پلانے کیلئے کہا۔ وہ جُوس بنانے لگا اور اتنے میں کئی مقامی لوگوں نے اُن کو گھیر لیا۔ وہ سب گرم جوشی سے اوتارسنگھ سِدھو اور بیبا بلونت کو مِل رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ وہ لوگ پاکستان بننے کے وقت لُدھیانہ، فیروز پور، جالندھر، نکودر وغیرہ سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں۔ اُنھیں بھی اپنی جنم بُھومی دیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ جُوس پینے کے بعد جب اوتارسنگھ پیسے دینے لگا تو پھل والے نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ بیبا بلونت اور سِدھو نے سمجھایا کہ آپ غریب ہو، اس لئے پیسے لے لو۔ مگر وہ نہ مانا۔ خیر جب وہ سب کار میں بیٹھے تو کافی دُور جانے کے بعد خالد حسین نے دیکھا کہ دو لفافے سیٹ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے جن میں کِنّو تھے۔ پوچھنے پر ڈرائیور نے بتایا کہ کِنّو کے لفافے اُسی پھل فروش نے رکھے ہیں۔ غریب دِل کے کتنے امیر ہوتے ہیں، یہ لفافے اس کا منھ بولتا ثبوت تھے۔ جب خالد حسین ڈاکٹر اوتارسنگھ سِدھو اور بیبا بلونت ساہیوال ضلع کے موضع گریجویٹ چک پہونچے تو سِدھو کے آبائی گھر کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ آخر گاؤں کی ایک 90 سالہ بُڑھیا نے سِدھو کے والد گوربخش سنگھ کے گھر کی نشان دہی کی اور کہا کہ اُس نے گوربخشے کو

گود میں کِھلا یا ہے۔گاؤں میں ایک مسجد اور تین مکان پُختہ تھے جبکہ باقی سارے مکان کچے تھے۔ اُن لوگوں نے کھانے پینے کا بندوبست کیا اور سب نے اپنے اپنے گھر سے پکا ہوا کھانا لا یا اور گاؤں کی چوپال میں سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھایا۔ بیبا بلونت نے اُس منظر کو اپنے کیمرے میں قید کر لیا اور وہ فوٹو گراف مجھے خالد حسین نے دِکھائے تھے۔جن میں گاؤں کا پیار جھلکتا تھا۔خالد حسین نے مجھے تفصیل سے اپنے پہلے دورۂ پاکستان کے بارے میں جانکاری دیتے ہوئے بتایا تھا کہ پاکستانی عوام بھارت کے لوگوں کیلئے پیار اور محبت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ جب بھی ہندوستانی ہندُو کٹاس راج کی یاترا کے لئے چکوال جاتے ہیں تو وہاں کے لوگ یاتریوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور جب سکھ بھائی ننکانہ صاحب، پنجہ صاحب اور کرتار پور کے گوردواروں کی یاترا کرنے جاتے ہیں تو پاکستانی عوام اُن کی مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔جب تینوں دوست ساہیوال سے واپس آنے لگے تو ڈرائیور نے کہا کہ یہاں سے پندرہ کلومیٹر دور ہڑپا شہر کے آثار ہیں۔اگر دیکھنا چاہیں تو وہ اُنھیں وہاں لے جا سکتا ہے۔خالد حسین نے اُونچی آواز میں کہا۔''ضرور جائیں گے''۔ڈرائیور اُنکو ہڑپا دکھانے لے گیا، جو موہن جودوڑو اور ہڑپا تہذیب کا حِصہ ہے اور یہ دونوں شہر دراوڑوں اور بعد ازاں آریوں نے بسائے تھے۔کئی میلوں پر محیط کھُدائی ہوئی تھی اور جو آثار برآمد ہوئے تھے، اُنکو ایک بڑے میوزیم میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ میوزیم دیکھنے لائق ہے۔خالد حسین نے بتایا تھا کہ مغربی پنجاب کے کئی تاریخی علاقوں میں ہزاروں سال پُرانی تہذیب کے آثار ملے ہیں۔جن میں ملتان، سبّی بلوچستان، مہرگڑھ، جہلم، گجرات، چکوال وغیرہ مشہور ہیں۔انہی علاقوں میں وید لکھے گئے۔اُپنشد لکھے گئے۔اسی علاقے میں سکندر اور پورس کی لڑائی ہوئی۔راولپنڈی سے تیس کلومیٹر دور ٹیکسلا کا تاریخی قصبہ ہے جو کبھی گندھارا تہذیب کا مرکز تھا۔خالد حسین کا کہنا تھا کہ پنجاب، خیبر پختون خواہ اور بلوچستان میں ویدک دھرم، بُدھ مت، جین مت اور اسلامی تہذیب کی نشانیاں بتاتی ہیں کہ بے شک مُلک تقسیم کر لو، زمین بانٹ لو لیکن مشترکہ تہذیب، زبان اور ثقافت کی جڑیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ اُن کو بانٹا نہیں جا سکتا۔یہ بات ہمارے سیاست دانوں اور مذہبی ٹھیکیداروں کو سمجھنی چاہئے۔ ہندوستان اور پاکستان بنیادی طور پر ایک ہی اکائی ہیں۔لہذا لوگوں کو آپس میں ملنے دیا جائے۔ پاسپورٹ اور ویزا کی بندشیں ختم کی جائیں۔خاص کر جموں وکشمیر کے عوام کے لئے۔تا کہ لوگ اپنے خُون کے رشتوں سے مِل سکیں۔اُوڑی۔مظفر آباد اور ''چکاں دا باغ'' کی طرح جموں۔سیالکوٹ، ٹیٹوال۔شاردا (نیلم ضلع) اور کرگل۔اسکردُو کے پُرانے راستے دوبارہ

بحال کئے جائیں۔اگرامریکہ اورکنیڈا اوربھارت ،نیپال میں پاسپورٹ اورویزاکے بغیرسفرکیاجاسکتاہےتوہندوستان اور پاکستان میں کیوں نہیں۔خالدحسین کا کہنا تھا کہ ہمارے صوفیوں اورسنتوں کا کلام ہمیں کبھی جُدانہیں کرسکتا۔اصل میں زمین کبھی نہیں تقسیم ہوتی۔زمین کوتقسیم کرنے والے مرکھپ جاتے ہیں۔شام دیرگئے جب وہ واپس آئے تواُنکاانتظار ہورہا تھا کیونکہ ہندوستانی ڈیلیگیشن کولیکرقصور بابابُلھےشاہ کےمزار پرحاضری دینے جانا تھااورللیانی کے''پنجابی کھوج گھر''میں مشاعرے میں شرکت کرنی تھی۔جہاں قصوروالوں کی طرف سے عشائیہ کابندوبست کیاگیاتھا۔ خالدحسین نے بابابُلھےشاہ کےمزار پرچادرچڑھائی اوراپنے روحانی مُرشد کےقدموں میں کچھ دیربیٹھ کردُعائے خیرمانگی۔رات دیرگئے وہ لوگ واپس لاہورآگئے۔تیسرے دِن محفل افسانہ اورمشاعرہ تھا۔محفلِ افسانہ میں خالدحسین نے اپنی کہانی ''حلالہ''پڑھی،جِسے پروفیسرجمیل احمد پال نے بعدازاں اپنی میگزین''سویرانٹرنیشنل''میں چھاپا۔اُسی دِن پنجاب رائٹرزگلڈ لاہورکی طرف سے ایک خصوصی نشست کااہتمام کیاگیاجس میں خالدحسین کےعلاوہ چنداور بھارتی ادیبوں کومدعوکیاگیا۔اُس نشست کی صدارت مشہورناول نگاراورافسانہ نگارالیاس گھُمن نے کی جبکہ کاروائی کی نظامت راجہ رسالُونے کیا۔رات کو''الحمرہ اڈیٹوریم''میں پنجابی گائیکی کالُطف اُٹھایاگیا۔دونوں پنجابوں کےفنکاروں نے پروگرام پیش کیا۔ہندوستانی پنجاب سے لوک ناچ کے ماہر پمی بھائی نے''جھُومر''پیش کیا۔اقبال باہُونے سلطان باہُوکاکلام پیش کیا۔اُستادحامدعلی خان اورشام چوراسیاگھرانے کےشفقت علی خان نے پنجابی گیت پیش کئے۔پروگرام کے بعد گوال منڈی کی''فوداسٹریٹ''میں بھارتی وفدکیلئے کھانے کاانتظام کیاگیاتھا۔اگلی صبح خالدحسین کے کچھ دوست چند گوردواروں کی زیارت کیلئے چلے گئے اورخالدحسین لاہورکی سیرکونکلا۔شالامار باغ دیکھااور باغ کے بغل میں مشہورپنجابی صوفی شاعرمادھولال شاہ حسین کی مزارپرگیااورفاتحہ پڑھی۔شاہی مسجد کے بغل میں علامہ اقبال کے مزار پرحاضری دی۔شاہی مسجد میں قرآن کریم کے قدیم اور نادر نسخے دیکھے۔شاہی قلعہ دیکھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ،مینار پاکستان،ہیرامنڈی اورانارکلی بازارمیں گھوما اور پھرداتا گنج بخش کےمزارمیں نمازاداکی اوردُعائے خیرمانگی۔عالمی پنجابی کانفرنس میں بڑی اہم قراردادیں پاس کی گئیں جن میں اہم یہ تھیں۔1۔دونوں ملکوں کےادیبوں،فنکاروں اورآرٹسٹوں کوایک دوسرے ملک میں آنے جانے کیلئے ویزااسسٹم ختم کیاجائے۔2۔پنجابی زبان کے دونوں رسم الخط دونوں ملکوں میں پڑھائے جائیں یعنی گورمُکھی مغربی پنجاب اور شاہ مُکھی مشرقی پنجاب میں پڑھائی جائے۔3۔

شاد مان چوک کا نام بدل کر بھگت سنگھ چوک رکھا جائے کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں بھگت سنگھ اور اُسکے ساتھیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ 4۔ پنجابی کلچرل گروپ ایک دوسرے ملکوں میں بھیجے جائیں۔ تا کہ پنجابی ورثہ کو سنبھالا جا سکے۔ خالد حسین جتنے دِن لاہور میں رہا، اُس سے ملنے ادیب اور شاعر آتے رہے۔ ''شاہ تاج'' ہوٹل کے جس کمرے میں وہ ٹھہرا تھا وہاں کی ہر شام خوشگوار بن جاتی کیونکہ وہاں مشہور گلوکار پرویز مہدی سابقہ ممبر اسمبلی اور شاعر اسلم گورداسپوری ،ادیب سلیم شہزاد، افسانہ نگار خالد محمود بھٹی جس نے بعد ازاں اپنا ادبی نام تبدیل کر کے ''نین سُکھ'' رکھ لیا ہے، جمیل احمد پال اور رانا شکور وغیرہ آجاتے۔ شفقت علی خان ،حامد علی بیلا کا بیٹا اور پرویز مہدی اپنی گائیکی سے سب کو محظوظ کرتے۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد خالد حسین ، پرنسپل اوتار سنگھ سِدھو اور بیبا بلونت لاہور میں رُک گئے تا کہ لاہور میں عید کی رونقیں دیکھ سکیں۔ لاہور میں خالد حسین کی خوش دامن صاحبہ کی پھوپھی زاد بہن خالہ رضیہ، گلبرگ ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتی تھیں۔ خالد حسین اور اُس کے دوستوں نے عید کا تہوار اُن کے ساتھ منایا۔ اور یوں یہ یادگاری سفر مکمل ہوا۔

اپنے ادبی سفر کے آغاز میں ریاستی کلچرل اکادمی نے خالد حسین کو پنجاب اور دہلی میں مقیم پنجابی ادبی شخصیتوں سے مُلاقات کرنے اور ملاقاتوں کے بعد اپنے تاثرات اور تجربات تحریری طور پر اکادمی کو پیش کرنے کیلئے کہا۔ جس کے لئے سارا خرچہ اکادمی نے ہی برداشت کیا تھا۔ خالد حسین کے اِس سفر کا پہلا پڑاؤ ''پریت نگر'' امرتسر تھا۔ وہاں سے کہانی کار مختار گل کو ساتھ لے کر وہ ڈاکٹر کرنیل سنگھ شیر گل اور گل چوہان (دونوں پنجابی افسانہ نگار) کے پاس امرتسر آیا، اور پھر اِن تینوں کو لے کر وہ پٹیالہ کے ایک گاؤں پہونچا جہاں چند پنجابی کہانیوں کا خالق موہر جیت رہتا تھا۔ چاروں نے رات اُس کے ہاں گذاری اور پھر صبح پانچ پیاروں کا یہ ٹولہ دہلی کے لئے روانہ ہو گیا تا کہ محترمہ امرتا پریتم، بی بی اجیت کور اور کرتار سنگھ دُگل وغیرہ کو ملا جا سکے۔ فیصلہ یہ ہوا اپنی اپنی جمع پُونجی کرنیل سنگھ شیر گل کے حوالے کر دی جائے۔ خرچے کا حساب کتاب وہی رکھے گا۔ خالد حسین کو چھوڑ کر باقی سب یار بیلی خونخوار شرابی تھے اور انہوں نے چند دِنوں میں ہی ساری جمع رقم شراب کی نذر کر دی۔ کرنیل سنگھ نے کہا کہ اُسکے پاس صرف چار سو روپے بچے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ عیاشی کو خیر باد کر کے رات گوردوارہ رکاب گنج میں گذاری جائے جو اُن دِنوں نیا نیا بنا تھا۔ موہُر جیت کو سگریٹ پینے کی لت تھی۔ اُسے سمجھایا گیا کہ وہ گوردوارے میں ایسی کوئی حرکت نہ کرے کہ سب کو خمیازہ بھگتنا پڑے۔ گوردوارے کے سیواداروں نے بڑا لذیذ لنگر پروسا۔ سونے کیلئے نئے بستر دیئے۔ اور خالد حسین

سے مودبانہ گذارش کی کہ وہ مریادہ قائم رکھتے ہوئے دُھومر پان (سگریٹ نوشی) کا پریوگ نہ کرے۔ خالد کی یقین دہانی پر دونوں سیوا دار چلے گئے ۔رات کے بارہ بجے مُوہر جیت اُٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔خالد حسین نے اُسے سختی سے منع کیا لیکن وہ نہ مانا۔ دونوں میں تلخ کلامی ہوئی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ گورودوارے سے باہر نکلا جائے ،اور کسی گھٹیا سے ہوٹل میں رات گذاری جائے۔وہاں سے یہ پانچ پیارے پیدل چلتے ہوئے پہاڑ گنج کے ایک بیکار سے ہوٹل پہونچے اور رات گذاری۔موہُر جیت حرامی کی بدولت ساری رات عذاب میں گُذری۔صبح ناشتہ کیا اور باقی کی رقم بِل چُکانے میں ختم ہوگئی۔ڈاکٹر کرنیل سنگھ شیر گِل کا بڑا بھائی انڈین نیوی کے مرکزی دفتر میں افسر تھا۔کرنیل نے اُس سے پیسے مانگے اور خالد حسین سمیت سب کو ریل اور بس کا کرایہ دیا۔ساتھ میں سو سو روپیہ راستے کے خرچے کے لئے دیا تا کہ سبھی خیر وعافیت اپنے اپنے گھر پہونچیں۔ خالد حسین اس سفر میں کسی کو نہ مِل سکا۔ اُس نے دوبارہ پنجاب اور دہلی کا سفر کیا تا کہ ادیبوں اور دانشوروں سے مِل کر رپورٹ اکادمی کے دفتر میں جمع کرا سکے۔

اپنی ادبی آوارہ گردی کا ایک اور قِصہ خالد حسین نے مجھے سُنایا تھا وہ یوں تھا کہ ایک بار ادبی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے خالد حسین لُدھیانہ گیا۔اُس کے ساتھ مختار گل بھی تھا۔رات گذارنے کیلئے مشہور شاعر سُرجیت پاتر کا انتخاب ہوا جو اُس وقت کرایے کے مکان میں اندرون شہر رہتا تھا۔اور آرٹسٹ عجائب چترکار کا ہمسایہ تھا۔سُرجیت پاتر نے پُرتپاک استقبال کیا ۔ وہاں پاتر کا ایک اور دوست بھی ٹھہرا تھا ۔چنانچہ خالد حسین کی آمد کو سلیبریٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ۔ڈاکٹر سُرجیت پاتر نے اپنے نوکر نیپالی گورکھے سے دوسو روپے مانگے تو اُس نے کہا کہ ''شالا سارا پیسہ تو صاحب آپ نے مجھ سے لے لیا ۔اب ہمارے پاش کُچھ نہیں ہے''۔اب سُرجیت پاتر اور اُسکے دوست نے چوڑا بازار جانے کیلئے خالد اور مختار کو ساتھ لیا۔سبھی رکشا میں چوڑا بازار پہونچے۔خالد حسین اور مختار گل کو کتابوں کی ایک دُکان پر کھڑا کر کے وہ دونوں بازار کے چکر لگانے لگے۔کچھ دیر کے بعد دونوں واپس آئے ۔وہ بہت خوش تھے ۔اُن کے ہاتھ میں شراب کی ''سونفی'' مارکہ دو بوتلیں اور تلی ہوئی دو کلو مچھلی اور تندُوری نان تھے۔

رکشے سے ہی سبھی واپس سُرجیت پاتر کے ہاں پہونچے۔خالد حسین کے پوچھنے پر کہ یہ سودا سلف کیسے خریدا؟ پیسے کہاں سے آئے تو وہ کہنے لگے کہ ایک حسینہ سے اُدھار لئے۔ بہانہ یہ بنایا کہ وہ امرتسر میڈیکل کالج میں تیسرے سال کے طالب علم ہیں اور لُدھیانے اپنے بڑے بھائی

سے ملنے آئے تھے لیکن وہ گاؤں جا چکا ہے۔ اب اُن کے پاس واپس جانے کیلئے پیسے نہیں ہیں۔ اُنھیں دو سو روپے اُدھار دے دیں۔ امرتسر سے منی آرڈر کے ذریعہ رقم لوٹا دی جائے گی۔ یوں خالد حسین کو سیلی بریٹ کیا گیا۔ اس قسم کی ادبی آوارہ گردی کے کئی قِصّے خالد حسین سے منسوب ہیں، جن کو وہ مزے لے لے کر سُنایا کرتا تھا۔ ان قِصوں سے پتہ چلتا تھا کہ پنجابی ادبی دوستوں کے ساتھ اُس کے رشتے کتنے گہرے تھے جو اُسکی وفات تک قائم رہے۔

جالندھر کی پوسٹنگ کے دوران خالد حسین کا دفتر اور رہائش شاستری چوک میں تھی، جہاں ہند سماچار گروپ کا دفتر، ملاپ، پرتاپ، اجیت، نواں زمانہ اور کئی دیگر اخباروں کے دفاتر ساتھ ساتھ تھے۔ پنجابی اور اُردو کے ادیب اور صحافی تقریباً روزانہ خالد حسین کے پاس آتے۔ سیاست کے علاوہ ادب پر بھی بات چیت ہوتی۔ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے اطلاعتی مرکز جالندھر کو مبلغ چالیس ہزار روپے بریفنگ گرانٹ کے طور پر ملے تھے تاکہ پی، آر، او اخباروں کے مدیروں اور دیگر صحافیوں کی اس گرانٹ سے آؤ بھگت کر سکے اور وہ جموں و کشمیر کے حالات اور ریاستی حکومت کے بارے میں مثبت (Positive) لکھیں۔ بلاناغہ آنے والوں میں جالندھر ریڈیو کا ڈپٹی ڈائریکٹر اور پنجابی کا منفرد شاعر سوہن سنگھ مشیا بھی تھا جو سیر کرنے کے بہانے ہر صبح خالد حسین کے گھر آتا اور سگریٹ نوشی کرتا۔ چائے کا کپ پیتا اور واپس چلا جاتا۔ سنت سنگھ سیکھوں، سادھو سنگھ ہمدرد، ڈاکٹر عطر سنگھ، کلدیپ سنگھ بیدی، پریم پرکاش کھنوی، کرتار سنگھ دُگل، ڈاکٹر کیرتی کیسر، ڈاکٹر سروج رانی اور کئی دیگر ادیب اور دانشور آتے۔ چائے کے کئی دور چلتے اور شام کو دارُو اور مچھلی سے محفلیں سجتیں۔ جس کی وجہ سے صحافتی حلقوں میں خالد کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا تھا۔ خالد حسین کے مضامین اور ریاست سے متعلق مُثبت خبریں چھپتی رہتیں۔ اپنی محنت، صدِق اور خلُوص کی وجہ سے خالد حسین نے ادبی حلقوں میں بھی اپنی ایک پہچان بنالی تھی۔ وہ زمین سے جُڑا ہوا انسان تھا اور اکثر بابا فریدؔ اور بُلھے شاہ کے اشعار سُناتا جن کو وہ اپنی رُوح کی خوراک کہتا ؎

جے تُوں عقل لطیف کالے لِکھ نہ لیکھ اپنے گریبان میں سر نیواں کر دیکھ (بابا فریدؔ)

ترجمہ:

اگر تُو عقل مند ہے کالے لِکھ نہ لیکھ اپنے گریبان میں سر جھکا کر دیکھ

اللہ سائیں خالد حسین کی بخشش فرمائے۔

☆☆☆

گوشہ

زنفر کھوکھر

ZANFAR KHOKHAR
POST OFFICE SAJ
THANNA MANDI
RAJOURI-185212
(JAMMU & KASHMIR)
CELL-9858009983

Zanfar khokhar ka Fan, Mashaheer ki Aara

# زنفر کھوکھر کا فن، مشاہیر کی آراء

**(آنند لہر)**

زنفر کھوکھر کے افسانوں کے متنوع موضوعات میں "عورت" کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے، جہاں وہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تو ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان حوادث کا شکار بھی ہے جو مردوں کے اس سماج میں جا بجا وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ زنفر کھوکھر نے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت محض شو پیس نہیں بلکہ عورت کا وجود ایک ایسا درپن ہے جس میں یہ بے حس سماج اپنی کھوکھلی رنگا رنگی کے ساتھ ساتھ اپنی بے رنگی کا نظارہ بھی کر سکتا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے سیاسی اور سماجی "بحران" کو بھی زنفر کھوکھر نے اپنی افسانوی کائنات میں نمایاں جگہ دی ہے اور سرحدی علاقوں میں رہنے والوں کے دگرگوں حالات کا نقشہ بڑی مہارت کے ساتھ کاغذ پر اتارا ہے۔ ایک طرف دہشت گردی دوسری طرف سرکاری ایجنسیوں کا آہنی شکنجہ اور تیسری طرف معصوم بے گناہ ، بے قصور اور سادہ لوح عوام کی مجبوریاں اور لاچاریاں، ان تینوں کیفیات کا کھلا مظاہرہ زنفر کھوکھر کے افسانوں کا نمایاں وصف ہے۔ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی ہمت موصوفہ میں بدرجہء اتم موجود ہے جبھی تو وہ ایسے افسانوں کی خالق بنی ہیں جنہیں لکھتے ہوئے بڑے بڑے دل گردے والے بھی لرزنے لگتے ہیں اور اپنے دامن کو بچانے کے لئے افسانے کے بنیادی لوازمات کا گلا ہی گھونٹ دیتے ہیں۔

**(امین بنجارا)**

ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کے حوالے سے زنفر کھوکھر صاحبہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ وہ پندرہ بیس برس سے مسلسل لکھ رہی ہیں اور اردو کے نمائندہ رسالوں اور اخباروں میں قرینے سے چھپ رہی ہیں۔ زنفر کھوکھر کے افسانوں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ قیاس پر حقیقت کا ملمع چڑھانے سے وہ گریز کرتی ہیں۔ ان کی چشمِ بینا میں لگا ہوا کیمرہ انہیں موضوعات پر کلک کرتا ہے جو موضوعات حقائق سے مملو ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری خود کو ان کے افسانوں کے

قریب محسوس کرتا ہے۔کبھی کبھار قاری کو یوں لگتا ہے کہ مصنفہ نے وہ بات کہہ دی ہے جو اس کے ساتھ بیت چکی ہے اور جسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔اچھوتے موضوعات، چھوٹے چھوٹے واقعات، فکر انگیز لمحات، اندھیروں اجالوں کی بارات اور ظریفی میں ڈوبے ہوئے تیروں کی سوغات کا برمحل استعمال کر کے زنفر کھوکھر نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ افسانہ کہنے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے اور کسی بھی فن میں کامیابی کا راز فن کار کے "اپنے انداز" ہی میں مضمر ہے۔میرے خیال میں فکشن کے شعبے میں زنفر کھوکھر نے اتنی منزلیں طے کر لی ہیں کہ توصیف وتوقیر، عزت وشہرت اور انعام واکرام کی صورت میں ان کے فن کی پذیرائی کرنے میں یہ معاشرہ افتخار محسوس کر سکتا ہے۔

**(ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال)**

دخترِ کشمیر زنفر کھوکھر بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور ان کے افسانوں کے تین مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔پچھلے دو تین سالوں میں انہوں نے مختلف النوع موضوعات پر دلچسپ انشائیے لکھے ہیں۔ان مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر افسانوی ادب کے اسالیب کے ذریعے بھی وہ اپنی بات کہنے پر قادر ہیں۔طنز اور مزاح ان کے انشائیوں کا اصل جوہر ہے۔معاشرے کی بوالعجبیوں، سیاست کی ریاکاریوں اور اقتدار کی ہوس وتباہ کاریوں کے ذکر نے ان کی تحریر میں فکر انگیزی پیدا کی ہے۔زنفر نے اس فکر انگیزی پر مایوسی یا تلخی کا سایہ پڑنے نہیں دیا۔زنفر (جس سے با وقار خاتون مراد ہے) نے بڑے پر وقار اور خوشگوار انداز میں اپنے عہد کی برائیوں کو ہدف بنایا ہے۔وہ کم آبادی والے پہاڑی علاقے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان کی فکر اور انشائیوں کا کینوس وسیع ہے۔اور ان کا مشاہدہ ہم عصر شعور اور عصری حسیت کا غماز ہے۔وادیء کشمیر کی شگفتگی اور تازگی ان کے اسلوب اور مزاح پر حاوی ہے۔انشائیوں میں طنز کے جوہر اور مزاح کے جھمکے ٹانکنا زنفر کو خوب آتا ہے۔اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی دور میں ہی زنفر کھوکھر نے طنز ومزاح کے موجودہ ادبی منظر نامے میں اپنے لئے خاص جگہ بنالی ہے۔ان کے انشائیوں کی کتابی صورت میں اشاعت کو میں طنز ومزاح کے ادب میں ایک اچھا اضافہ سمجھتا ہوں۔

**(افتخار امام صدیقی)**

شیریں سخن، رشتوں کی پاسدار، سوچ جہاں سے دنیا کو کشید کرنے والی، پر اعتماد، شگفتہ قلم، لفظ لفظ تخلیق، سوچ سوچ تحریر، ہندو پاک سرحد کی بیٹی، راجوری کی کہانی کار، تخلیقی بیانیہ میں چونکانے والی، اپنے نام کی ہی طرح منفرد بیانیہ، افسانہ جہاں کی معروف کہانی کارہ۔یہ ہیں اردو فکشن نقادوں

کی تنقید کے لئے نیا نام۔۔۔زنفر کھوکھر۔

**(خالد حسین)**

زنفر کھوکھر جموں و کشمیر میں اردو افسانے کی ایسی نسائی آواز ہے جس کے تابناک مستقبل کے روشن امکانات ہیں۔

**(آنند لہر)**

امین بنجارا صاحب کی وساطت سے جب مجھے زنفر کھوکھر صاحبہ کے دو افسانوی مجموعے "خوابوں کے اس پار" اور" کانچ کی سلاخ" پڑھنے کے مواقع ملے تو زنفر کھوکھر کے افسانوی لب و لہجے سے جہاں از حد محظوظ ہوا، وہیں مجھے اس بات کا قائل بھی ہونا پڑا کہ زنفر کھوکھر ریاست جموں و کشمیر کے افسانوی ادب کے حوالے سے ایک منفرد نام اور مقام کی مستحق ہیں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں ایک طویل عرصے کے بعد کسی خاتون افسانہ نگار میں وہ دم خم دیکھ رہا ہوں جو دم خم اردو کے بڑے بڑے افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں پایا جاتا ہے۔

**(ڈاکٹر الطاف انجم)**

مجھے خوشی ہے کہ ہماری ریاست میں زنفر کھوکھر جیسی نسائی آواز ایک منفرد و مضبوط اور مستحکم قلعہ ہے جسے ہم فخر اور اعتماد کے ساتھ اردو دنیا میں اپنا نمائندہ تصور کر سکتے ہیں۔

**(عرش صہبائی)**

میں شروع سے ہی اپنے اس قول کا گرویدہ ہوں کہ ایک اچھا انسان ہی ایک اچھا ادیب یا شاعر بن سکتا ہے۔ زنفر کھوکھر صاحبہ سے جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی۔ ان سے کئی برسوں سے غائبانہ تعارف حاصل تھا۔ ان کے اکثر افسانے میری نظر سے گزرتے رہے ہیں اور مجھے متاثر کرتے رہے ہیں۔ ان کا مجموعہ" ہم سب ایک ہیں" جب حاصل ہوا تو اس بات کا انکشاف ہوا کہ افسانوں کے علاوہ انہوں نے انشائیے بھی تحریر کئے ہیں اور طنز و مزاح میں بھی طبیعت آزمائی ہے۔ مذکورہ مجموعہ کے مطالعے سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ کھوکھر صاحبہ زندگی میں تعمیری نظریہ رکھتی ہیں۔ جب کسی کو تعمیری نظریہ حاصل ہو جائے تو اس میں بے باکی اور صاف گوئی کا ہونا قدرتی بات ہے۔ ایسے میں وہ اپنی تحریروں میں ماحول کی صحیح معنوں میں عکاسی کرتا ہے۔ سماج میں جو اچھائیاں یا برائیاں ہوں وہ ان کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرنے سے کبھی ہچکچاتا نہیں۔ یہ بات کھوکھر صاحبہ پر صادق آتی ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ وہ اپنے افسانوں، انشائیوں اور طنز

ومزاح کو اور اونچائیوں پر لے جائیں۔

**(اعظم ساگر)**

زنفر جی، سلام مسنون۔آفریں صد آفریں! اس احساس کو جو ایک پختہ تحریر بن کر آپ کے ادبی ذوق میں ارتعاش کا محرک بنا۔زندگی کی نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اپنے تاثرات حسین پیرائے میں نہایت لطیف اور معطر الفاظ میں لپیٹ کر اچھوتے، پرکشش اور دل گداز انداز سے افسانوں کی صورت میں منصئہ شہود پر لا کر یقیناً آپ نے بڑے بڑے ادیبوں کو ورطہء حیرت میں ڈال دیا ہے۔

" خوابوں کے اس پار" افسانوی مجموعہ فن افسانہ نگاری پر آپ کی مکمل دسترس کا غماز بھی ہے اور آپ کے تابناک ادبی مستقبل کا نقیب بھی۔روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور مصائب وآلام میں الجھ کر زندگی کرنے کی قوت بھی بخشتا ہے۔زندگی حادثات کا مجموعہ ہے اور یہ افسانے سچے واقعات کو اجاگر کرتے ہیں۔زندگی مجموعہء اضداد ہے مگر ہمت کی کامرانی مسلمہ ہے۔یہی پیغام ہے آپ کی کتاب" خوابوں کے اس پار" کا۔

القصہ آپ کے افسانے زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔یہ افسانوی مجموعہ آپ کے تخیل کی بلند پروازی کی نوید بھی ہے اور بیسویں صدی کی آواز کی دلیل بھی۔آپ اپنا ادبی سفر دل جمعی اور مستعدی سے جاری رکھیں۔

اپنے کسی شاگرد کو شہرت کی فضاؤں میں اڑتا دیکھ کر خوش ہونا قدرتی بات ہے، مگر میرا معاملہ کچھ شدید نوعیت کا ہے۔میری خوشیوں کی انتہا پیمانوں کی محتاج نہیں۔اس لئے کہ زمانہء طالب علمی میں آپ کی قابلیت، شرافت، معصومیت، بلندخیالی اور حسن سیرت کا رعب پورے اسکول پر چھایا ہوا تھا۔آپ کے اندر مضمر ایک مہذب، سنجیدہ، دوراندیش، محنتی، باکردار، زیرک، حساس اور حوصلہ مند خاتون کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کر کے میں اکثر وبیشتر کہا کرتا تھا" تابندہ بچپن ایک درخشندہ مستقبل کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔یہ لڑکی یقیناً ایک دن قدآور شخصیت بن کر ابھرے گی۔" آج اپنے اس خواب کو شرمندہء تعبیر ہوتے دیکھ کر مسرت اور خوشی جو مجھے ہو رہی ہے، بیان سے باہر ہے۔اس دور میں تو زنفر کھوکھر کا مطلب نہ جان سکا اور شاید کوئی لغات بھی اس لفظ کی متحمل نہیں ہے۔مگر آج آپ کی اس ادبی تخلیق کو دیکھ کر یک دم میرے ذہن میں زنفر کا مطلب واضح ہو گیا ہے۔آپ کی نذر کرتا ہوں۔

زنفر۔۔عورت کی شان وشوکت۔زنفر۔۔عورت کا رعب و داب۔آخر میں دعا اور سلام کے ساتھ پرتپاک ہدیہء مبارک تحفتاً پیش کر کے اجازت چاہتا ہوں۔

**(دیپک بدکی)**

گذشتہ سال میں نے جس کتاب کو پڑھا اور متاثر ہوا، وہ ہے زنفر کھوکھر کا افسانوی مجموعہ "عبرت"۔ پاکستانی سرحد کے پاس دور دراز علاقے راجوری کے ساج گاؤں میں رہنے والی اس نڈر اور بے باک قلم کار نے اس مجموعے میں نہ صرف نرینہ عصبی سماج کے خلاف آواز اٹھائی ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ پولیس کی زیادتیوں، دہشت گردی اور وطن بدری کے خلاف (تین وارداتیں، وہ کون تھا؟، اب کیا ہوگا، کب تلک؟، دہشت کا سماں، دھماکہ) انہوں نے جو افسانے لکھے ہیں، ان کے ہم عصر ادب میں اور کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ زنفر ایسے علاقے میں رہتی ہیں جہاں قدم قدم پر زندگی موت کے ساتھ رقص کرتی ہے۔ مگر یہ ان کی بہادری ہے کہ سچ کو سامنے لانے میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ انہوں نے یہ درد پچیس سال خود جھیلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتی ہیں" ہم نے گھر کو تو مقفل کر دیا ہے مگر ہماری سرحدیں! ہم نے ایٹم بم تو بنا لیے مگر ہماری یہ سرحدیں! ہماری سرحدیں!"

اگر وہ کسی میٹرو کی ساکن ہوتیں، فلموں کے ساتھ وابستہ ہوتیں یا پھر نارنگ یا فاروقی گروپ کی رکن ہوتیں تو آئے دن سیمیناروں میں شرکت کی انہیں دعوتیں ملتیں اور نہ جانے کن کن ایوارڈوں سے نوازی گئی ہوتیں۔ یہی اردو ادب کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

**(پریمی رومانی)**

زنفر کا اسلوب صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔ اس میں کوئی پیچ وخم نہیں۔ وہ براہ راست اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی قائل ہیں۔ وہ زندگی کے نازک معاملوں پر بھی بڑی بے خوفی کے ساتھ قلم چلاتی ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ" کانچ کی سلاخ" ایک باصلاحیت خاتون افسانہ نگار کی آمد کا پتہ دیتا ہے۔

**(مختار یوسفی)**

"ہم سب ایک ہیں" قارئین میں سراہی جائے گی اور طنز و مزاح کی ادبی تاریخ میں خوشگوار اضافے کا سبب بنے گی۔ دل کی گہرائیوں سے مبارک باد کے ساتھ نیک خواہشات اور چند اشعار۔

زنفر کھوکھر کی بات کیا کہنے　　جموں وکشمیر جس پہ ناز کرے

مسکراہٹ وہ سبھی کو بانٹیں — درد وغم کو بھی جڑ سے ہی کاٹیں
پیار کے تخم روز بوتی ہے — نثر اس کی دلوں کو چھوتی ہے
ڈر کے ظالم سے کب وہ رہتی ہے — بات حق کی ہمیشہ لکھتی ہے
دل سے مختار کر رہا ہے دعا — اس کی تخلیق جگمگائے صدا

**(پروفیسر عبدالمنان طرزی)**

زنفر کھوکھر ہیں اک فکشن نگار — آپ نے اس صنف کو بخشا وقار
بے بہا دولت جو ہے احساس کی — آپ کی بے شک ہے یہ دولت بڑی
اپنے صوبے کی فضائے انتشار — ان پہ ہی لکھ کر بنی ہیں تاجدار
پانچ آئی ہیں کتابیں آپ کی — دولت اعلیٰ جو ہیں افسانوی
ہیں جو ذاتی واقعات و تجربے — ان کے افسانوں کی وہ دولت بنے
بے بسی، بے چارگی، محرومیاں — ان کے افسانوں میں ہیں درد نہاں
جبر و استبداد بھی پولیس کے — ان کے فن میں ہیں جگہ پاتے رہے
جس کو کہتے شدت احساس ہی — ان کے افسانوں کی ہے خوبی بڑی
ہے بنت افسانوی آنسو بھری — داستاں ہے ظلم و جور و جبر کی
کچھ سماجی بدعتیں ہیں اور بھی — جن میں زنفر کی ہے دانائی چھپی
یہ ہیں افسانہ نگار کامیاب — لائی ہیں اردو میں سعی ءلاجواب

☆☆☆

Zanfar Khokhar by Wali Mohd. Aseer Kishtwari (Kishtwar)

ولی محمد اسیر کشتواڑی (کشتواڑ)

# زنفر کھوکھر

زنفر کھوکھر موضع ساج ضلع راجوری (جموں وکشمیر) کی ایک جانی مانی افسانہ نگار اور انشا پرداز ہیں۔ وہ 19 دسمبر 1957 کو کاہنڈی گلہوتہ تحصیل مینڈھر ضلع پونچھ کے محمد شفیع کھوکھر اور بگو بی بی کے گھر پیدا ہوئیں۔ گورنمنٹ پرائمری اسکول کاہنڈوی گلہوتہ سے پانچویں اور گورنمنٹ ہائی اسکول برنی (مہنڈر) سے مڈل اور میٹرک کے امتحانات پاس کرنے کے بعد انہوں نے پرائیوٹ طور پر اپنی تعلیم جاری رکھی۔ 1975 میں زنفر کھوکھر کی شادی ساج (راجوری) کے محمد حنیف سے ہوئی جو محکمہء تعلیم میں مدرس تھے۔ آپ ستمبر 1978 میں محکمہ تعلیم میں ٹیچر تعنات ہوئیں۔ اور وہیں سے 1985 میں بی۔ایڈ کی پیشہ ورانہ تربیتی ڈگری بھی حاصل کی۔ بالآخر دسمبر 2017 میں بطور ہائر سیکنڈری لکچرر سبک دوش ہوگئیں۔

زنفر کھوکھر کی پہلی کہانی 1988 میں بعنوان "نصیحت" تشکیل میں شائع ہوئی جو اس وقت راجوری سے نکلتا تھا۔ آپ کی کہانی "نسخہ" 1991 میں ہند سماچار میں چھپی۔ ابھی تک ان کے افسانوں کے تین مجموعے "خوابوں کے اس پار" (1999) "کانچ کی سلاخ" (2003) اور "عبرت" (2010) منظر عام پر آ گئے ہیں جبکہ انشائیوں اور طنز و مزاح پر مبنی مضامین کا مجموعہ "ہم سب ایک ہیں" 2016 میں شائع ہوا۔ ان کے پہاڑی افسانوں کا ایک مجموعہ ابھی زیر ترتیب ہے۔ زنفر اردو کے علاوہ پہاڑی میں بھی افسانے اور کہانیاں لکھتی ہیں جو کلچرل اکیڈمی کے "شیرازہ (پہاڑی)" میں چھپتی رہی ہیں۔

ماہنامہ "شاعر" ممبئی، ماہنامہ "تریاق" ممبئی، شگوفہ (حیدرآباد) پرواز ادب (پنجاب) کسوٹی (پٹنہ) نگینہ (سرینگر) رنگ (دھنباد) شیرازہ (سرینگر) وغیرہ ملکی سطح پر چھپنے والے وہ رسالے اور جریدے ہیں جن میں زنفر کھوکھر کی کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ ماہنامہ "شاعر" ممبئی نے 2013 میں زنفر کھوکھر کا ایک گوشہ نکال کر انہیں قومی اور بین الاقوامی اردو دنیا میں اچھی طرح متعارف کیا۔ ایک اردو قلم کار کی حیثیت سے ایک خاتون کا خطہء پیر پنچال سے ابھر کر ایک خاص پہچان قائم کرنا ہی اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ مذکورہ خطے کے نہ صرف مرد بلکہ مستورات بھی اردو زبان و ادب کے ساتھ دلی لگاؤ

رکھتی ہیں۔مگر تعلیمی اداروں میں اردو پڑھائے جانے کے خاطر خواہ انتظامات نہ ہونے کی وجہ سے نئی پود کے کافی خسارے میں رہنے کا خدشہ لاحق ہو گیا ہے۔تاہم زنفر کھوکھر جیسے ہونہار مدرسین اور قلمکاروں کی موجودگی اردو کو زندہ رکھنے کے لئے ایک نیک شگون ہے۔ڈاکٹر صابر مرزا کلچرل آفیسر راجوری نے زنفر کھوکھر کو متعارف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"وہ ایک پسماندہ اور دور افتادہ علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی ادبی ذوق کو اپنی رگ و پے میں سموئے ہوئے ہیں۔ان کا یہ ادبی ذوق ان کی صلاحیتوں اور روز مرہ کی زندگی کے تجربات سے عبارت ہے اور یہی بات ہے کہ ان کی ہر تخلیق ہر نئے انداز کو اجاگر کرتی دکھائی دیتی ہے۔"

(خوابوں کے اس پار،ص،4)

بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سابقہ اسپیکر جموں وکشمیر اسمبلی وسابقہ وزیر مرزا عبدالرشید کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

"محترمہ زنفر کھوکھر ہم جیسے لوگوں کے لئے باعث رشک ہیں۔میں انہیں دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے افسانہ نگاری کی نگری میں قدم رکھا ہے۔مجھے امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں پختگی بھی آئے گی اور وہ اس وادیٔ عشق ومستی میں دور دور تک جھنڈے گاڑیں گی۔" (ایضاً،ص6)

افسانہ" سیکنڈ ہینڈ" زنفر کھوکھر کے پہلے مجموعے میں" تشویش" کے عنوان سے شامل ہے جسے ضروری ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ" کانچ کی سلاخ" میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔یہ افسانہ ہر لحاظ سے دلچسپ اور قابل قدر ہے۔زنفر کھوکھر کی افسانہ نگاری پر بات کرتے ہوئے جموں وکشمیر کے سربرآوردہ اردو افسانہ نگار نور شاہ نے لکھا ہے کہ" افسانوں کی دنیا میں زنفر کھوکھر کا مستقبل نہ صرف تابناک ہے بلکہ ان کی ذات میں ایک نئی نسوانی آواز کی گھن گرج بھی سنائی دیتی ہے۔"

" پتھر کی سل" زنفر کھوکھر کے پندرہ افسانوں کا تازہ اور چوتھا مجموعہ ہے جس کا مسودہ فی الوقت میرے پیشِ نظر ہے۔اس مجموعے پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی پتہ چلتا ہے کہ زنفر کھوکھر کو کہنہ مشقی نے افسانہ نویسی کے فن میں بڑی پختگی عطا کی ہے۔انہوں نے ہمت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے ایسے عمدہ فن پارے تیار کئے ہیں جو ضرور بہ ضرور ان کا نام روشن کرنے میں معاون و مددگار بنیں گے۔اس طرح بعض مخلص اصحاب قلم کی پیش گوئیاں بھی صحیح ثابت ہوگئی ہیں اور مجھے توقع ہے کہ اس کتاب کے اشاعت پذیر ہونے سے وہ اپنے فن کا لوہا منوانے میں پوری طرح کامیاب ہو جائیں

گی اور یہ کسی جہاں دیدہ اور رٹائرڈ خاتون کی ایک مستحسن تخلیقی کاوش ہوگی۔

"میں نے دیکھا" ایک انشائیہ نما افسانہ ہے۔آج کے دور میں علاج و معالجہ کروانا ایک عام آدمی کے لئے کاردار والا معاملہ بن گیا ہے۔محنت مزدوری پر روزی روٹی کمانے والوں کو اور بھی کئی پریشانیوں کا سامنا رہتا ہے۔ایک طرف حکومت نے بڑے بڑے شفاخانے کھول کر ان میں تعنات ڈاکٹروں کے لئے موٹی موٹی تنخواہوں کا انتظام کیا ہے تو دوسری طرف ڈاکٹر دفتری اوقات میں بھی ہسپتالوں سے بھاگ کر Clinics میں پرائیویٹ پریکٹس کر کے غریبوں کا خون چوسنے میں مصروف رہتے ہیں۔مفت اور سستا علاج کروانا تو اب خواب میں بھی ممکن نہیں ہے۔اسی حقیقت حال کو زنفر کھوکھر نے خوبصورت انداز میں مزدوروں کی زبانی بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کہانی کو اچھے انداز میں لکھا اور ترتیب دیا گیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے قارئین اس میں شامل افسانوں کا پوری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر کے یہ کہنے پر متفق ہوں گے کہ راجوری جیسے دور افتادہ علاقے میں رہائش پذیر ایک خاتون اچھے افسانے لکھ کر اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات کو انجام دینے میں ہمہ تن مصروف ہے۔

☆☆☆

"Ibrat" ke Afsane by Khalid Hussain (Jammu)

خالد حسین (جموں)

# "عبرت" کے افسانے

ایک افسانہ نگار کا دوسرے افسانہ نگار کے تخلیقی عمل اور رجحان پر لکھنا عجیب سا لگتا ہے، اور اگر لکھنے والا آپ کا ہم عصر ہو تو اور بھی مشکل۔ اس پر طرہ یہ کہ پیش لفظ یا دیباچہ لکھنے کے لئے فرمائش کی جائے۔ میری نظر میں ہر ایک افسانہ نگار کا اپنا ایک انفرادی مزاج اور اسلوب ہوتا ہے۔ زبان و بیان کے حوالے سے اس کی ایک الگ پہچان ہوتی ہے، لہذا جب کوئی ایک کہانی کار اس ضمن میں لکھے گا تو ضروری نہیں کہ وہ ایک نقاد کی طرح ہر پہلو کو ملحوظ خاطر رکھے اور ان تمام رموز کا احاطہ کرے جو کہانی کی بنت میں استعمال ہوتے ہیں۔

افسانے کی صنف اٹھارہویں صدی کی پیداوار ہے اور سب سے پہلے یہ صنف انگریزی ادب کا حصہ بنی۔ پھر فرانسیسی، روسی اور دیگر عالمی اور مقامی زبانوں نے اسے قبول کیا۔ ایشیا اور برصغیر ہند میں گو حکایتوں، قصوں اور کہانیوں کی صورت میں نثر صدیوں سے موجود ہے، چاہے وہ کتھا ساگر اور پنچ تنتر کی کہانیاں ہوں، گلستان و بوستان کی سبق آموز حکایتیں ہوں، داستانِ امیر حمزہ ہو یا قصہء چہار درویش ہو۔ یہ ساری نثر موجودہ کہانی کی ابتدائی شکلیں ہی ہیں لیکن ادب میں ناول اور افسانے کی اصناف انگریزی ادب کی ہی دین ہے۔ اردو میں پہلا افسانہ راشد الخیری کا "نصیر اور خدیجہ" ہے جو 1903 میں چھپا اور ناول 1897 میں چھپا جو عبدالکریم نے لکھا اور عنوان تھا "ریاض دلربا"۔ ناول کے برعکس افسانہ میں اختصار سے کام لیا جاتا ہے اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نیز واقعاتی تاثر کو گہرا کرنے کے لئے کم سے کم کرداروں کو سامنے لایا جاتا ہے۔ واقعات کے بجائے ایک واقعہ یا تاثر کو کہانی کا مرکزی نکتہ بنایا جاتا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ افسانے میں کئی تجربے کئے گئے۔ روایتی افسانہ، ترقی پسند افسانہ اور تجریدی افسانہ وغیرہ۔ لیکن ان تمام تجربات کے باوجود افسانہ وہی مقبول ہوا جو زندگی کے قریب ہو اور سماجی اقدار اور معاشرے کی اصلاح اور دیگر عوامل کو پیش کرنے کی سعی کرتا ہو۔ افسانہ نگار نہ تو واعظ ہوتا ہے اور نہ پند و نصیحت کرنے والا لیکن وہ ان امور کی نشاندہی ضرور کرتا ہے جو معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جموں وکشمیر میں تخلیق ہونے والے افسانوں کا انداز اور مزاج ملک کے دیگر علاقوں میں لکھے جارہے افسانوں سے الگ ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد ریاست کا سیاسی اور معاشی منظر نامہ ہمیشہ انتشار کا شکار رہا۔ یہاں حالات ہمیشہ دگر گوں رہے ہیں۔ عوام کی رائے ان کی نفسیات ان کے حالات، تہذیب وتمدن غرض مکمل سماجی سنکٹ سے مرکز کی کٹھ پتلی سرکاروں کی عدم توجہی مسائل کی گفت وشنید کے بجائے طاقت سے حل کرنے کا وطیرہ یا جوڑ توڑ اور لالچ سے قابض رہنے کی سبیلیں ڈھونڈنا ایسے معاملات ہیں جو عوام کے اندر بے چینی پھیلا رہے ہیں اور انہیں اسباب کے تحت گزری صدی کی آخری دہائی میں عوامی غم وغصہ اور بے چینی کا لاوا پھٹ پڑا جس کا ہمسایہ ملک نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور نوجوان نسل کو گمراہ کیا۔ اس عوامی تحریک کو دبانے کے لئے سرکاری دہشت گردی کے ردعمل میں ملی ٹینسی یا آتنکواد پلیگ کی طرح پھیلا اور عوام پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس گھٹن اور کشاکش سے ریاستی ادیب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست کے بیشتر افسانہ نویسوں نے انہیں حالات وواقعات کو مرکز بنا کر اپنے تخلیقی عمل کا اظہار کیا۔

محترمہ زنفر کھوکھر کا افسانہ بھی انہیں حالات و واقعات کی عکاسی کرتا ہے اور ایک حساس خاتون افسانہ نگار ہونے کے ناتے زنفر کھوکھر نے ایسے معاملات کو شدت سے محسوس کیا اور ضبطِ تحریر میں لائیں۔ زنفر کھوکھر کے دو افسانوی مجموعے "خوابوں کے اس پار" اور "کانچ کی سلاخ" منظر عام پر آچکے ہیں۔ "عبرت" ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ وہ "ہندسا چار"، "شاعر"، اور دیگر رسائل میں مسلسل چھپتی رہتی ہیں۔ عینی افسانہ لکھنا ان کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہاں! اہم بات یہ ہے کہ ضلع راجوری کے ایک دور افتادہ اور پس ماندہ گاؤں "ساج" میں رہ کر اپنے تخلیقی عمل کو جاری وساری رکھنا، یہ یقیناً قابل ستائش ہے۔

جہاں تک محترمہ زنفر کھوکھر کے تخلیقی رویے کا تعلق ہے تو ان کے ہاں کسی خاص رجحان کو تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ ان کے یہاں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، تجریدی اور علامتی تجربات اور حوالہ جات کو تشخص کرنے کا عملی اظہار موجود نہیں ہے۔ البتہ ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ اپنے قرب وجوار کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں اور آس پاس کے انہیں عوامل اور مشاہدے سے افسانہ کو کشید کرتی ہیں۔ جس بھی حادثہ یا واقعہ نے انہیں جھنجھوڑا اور متاثر کیا، انہوں نے اسے افسانہ بنا دیا۔ جن گھٹناؤں کو زنفر کھوکھر نے اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے وہ گھٹنائیں ایک مضبوط بنیاد رکھتی ہیں اور حقیقت کے قریب ہیں۔ اس لئے ان کی ادبی دیانت داری پر

ذرا بھی شک کرنے کا جرم نہ تو افسانے کے ناقدین کر سکتے ہیں اور نہ ہی افسانے کے قارئین۔

"عبرت" میں شامل افسانوں کو پڑھ کر لگتا ہے کہ زنفر کھوکھر نے اپنے ذاتی تجربے اور واقعاتی نقشے کو قاری کے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کی کہانیاں سماج کے مختلف رنگوں کی آئینہ دار ہیں۔دہشت گردی، بربریت، اغوا، بے چارگی، بے بسی، گھٹن، خوف، غصہ، لوٹ کھسوٹ، حراستی ہلاکتیں، ضمیر فروشی وغیرہ ایسے عوامل ہیں جو زنفر کی گرفت میں آنے کے بعد افسانوں کے موضوع بن جاتے ہیں۔سرحدی علاقوں میں فوج، پولیس، خفیہ ایجنسیوں اور دیگر حفاظتی اداروں کی طرف سے بے گناہ اور معصوم لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ" آگ زنی" املاک کی تباہی، قتل و غارت، فرضی جھڑپوں میں انسانی جانوں کا زیاں، عصمت دری اور دوسری طرف ہمسایہ ملک کی جانب سے آئے تربیت یافتہ ملی ٹینٹوں کا عوام پر مظالم ڈھانا، مجاہدوں کے بھیس میں نقلی دہشت گردوں اور غنڈہ عناصر کا غریب اور لاچار لوگوں کو تنگ کرنا، غرض عوام کا اس دو دھاری دہشت گردی کا مسلسل شکار ہونا ایسا پس منظر ہے جس میں زنفر کھوکھر کے افسانوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ان موضوعات پر زنفر کھوکھر کے افسانے خون رلاتے ہیں اور لگتا ہے اس حساس خاتون افسانہ نویس نے لہو میں قلم ڈبو کر لکھا ہے۔

"اب کیا ہوگا، کب تلک، دستک، دھماکہ، وہ کون تھا، دو حکمران، افسانے کم و بیش انہیں موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔افسانہ" اب کیا ہوگا" دونوں ملکوں کے عوام خصوصاً سرحدی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی امنگیں، آس اور امیدیں بندھنے اور ٹوٹنے کی کہانی ہے۔بھارت اور پاکستان کے سربراہوں کی ملاقاتیں اور پھر نشستن، گفتن اور برخاستن۔افسانہ" دو حکمران" دو طرفہ دہشت گردی سے مجبور اور بے بس عوام کے استحصال کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

ان موضوعات کے علاوہ زنفر کھوکھر نے کئی دیگر موضوعات پر بھی افسانے لکھے ہیں۔جیسے افسانہ" ہم ایک ہیں" جس میں آج کا پورا معاشرہ مبتلا ہے۔کہانی" اگلی کاروائی" میں ایک امیر زادہ ایک کم سن لڑکی کی عصمت دری کرتا ہے۔قانون اور سزا سے بچنے کے لئے مقامی پنچایت اور معتبر لوگوں کے دباؤ میں آکر اسی امیر زادے کے ساتھ اس لڑکی کی شادی کر دی جاتی ہے اور اس طرح یہ معاملہ حل کر لیا جاتا ہے۔لیکن وہ لڑکی امیر زادے سے اپنی رسوائی کا بدلہ یوں لیتی ہے کہ سہاگ رات کو ہی اس کا پوشیدہ عضو کاٹ کر اسے قتل کر دیتی ہے۔" بے ایمان" ایسا افسانہ ہے جس میں ایک رشوت خور ملازم سخت احتیاط اور ہوشیاری برتنے کے باوجود اسٹنگ آپریشن میں پکڑا جاتا ہے۔" کمائی" میں ایک ایسے بوڑھے کا ذکر ہے جو اپنی خود غرضی اور لالچی اولاد کے ہاتھوں تنگ آکر رات کو گھر سے

بھاگ نکلتا ہے اور فوجیوں کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔اور مرنے کے بعد اولاد کے لئے ایک لاکھ روپئے کے معاوضے کی رقم چھوڑ جاتا ہے۔" حرف آشنا" ایک ایسے نووارد شاعر کی کہانی ہے جو ایک بزرگ، زیرک اور علم شناس معلم پر اپنی بھڑاس لئے نکالتا ہے کیوں کہ اس نے نووارد شاعر کے مجموعہ کلام پر تقریظ لکھنے سے انکار کیا تھا۔کہانی " اور منگنی ٹوٹ گئی" میں مناسب اور قابل صورت دولہا دلہن کا ہونا ضروری قرار پایا گیا ہے۔سروقد مٹیار کے لئے ٹھگنے قد کا دولہا ہرگز قبول نہیں ہے۔" بلاعنوان" کہانی میں ایک اسی سالہ بڑھیا کا ذکر ہے جسے صائمہ پناہ دیتی ہے۔اس کہانی میں لاوارث بڑھاپے کی بے بسی بیان کی گئی ہے۔

" انتقامی" ایک سنکی اور ترش مزاج آدمی کی کہانی ہے جو پہلی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے اور اپنی غصیلی طبیعت کی وجہ سے ہر ایک سے لڑتا جھگڑتا ہے۔افسانہ" خیرات" میں ان بھیک مانگنے والوں کا ذکر ہے جو کئی بہانوں اور ترکیبوں سے اپنے آپ کو مستحق ثابت کرتے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں۔اسی طرح کہانی " پوچھئے مت" میں ایک منہ زور بیوی اور شریف النفس خاوند کی چپلقش کا اظہار ہے۔کہانی " دستک" بھی دہشت گردی اور سرکاری بربریت کے موضوع کا تسلسل ہے۔" راہ کا روڑا" کہانی میں سرکاری و نیم سرکاری اور نجی اداروں میں ہونے والی رنجشوں، عداوتوں اور افسروں کی تاناشاہی کا بیان ہے۔" دہشت کا سماں" افسانے میں زنفر کھوکھر نے سسرال والوں کے لالچ اور کھلی بربریت کا ذکر کیا ہے۔بہو کو جہیز کے لئے تنگ کرنا اور پھر مار ڈالنا اور قتل کا الزام دہشت گردوں پر ڈال دینا کہ سیما فوج کی مخبر تھی اور یوں ایک لاکھ کی رقم بھی سرکار سے وصولنا اس کہانی کا پلاٹ ہے۔" جواز" افسانے میں درجہ فہرست ذاتوں کے ایسے افراد کا بیان ہے جو خصوصی کوٹے کے ذریعہ نوکریاں حاصل کر لیتے ہیں اور قابل اور زیادہ پڑھے لکھے افراد رہ جاتے ہیں۔کہانی " آہ" ایک بوڑھے کی روداد ہے جو بیوی کے فوت ہو جانے کے بعد اولاد کے ہاتھوں پریشان ہے۔" وہ آئے تو سہی" ایک بیوہ کی کہانی ہے جو ایک شادی شدہ شخص کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اس سے شادی کر لیتی ہے اور پچھتاتی ہے۔

" عبرت" کے افسانوں کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ زنفر کھوکھر کے ہاں بناوٹ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔انہوں نے سماج کے اندر ہو رہی بے انصافیوں کو دیکھا ہے۔زخم سے رستے ناسور کی وہ عینی شاہد ہیں۔زندگی، موت، محبت، نفرت، دکھ، سکھ، امید اور ناامیدی کا انہوں نے گہرا مشاہدہ کیا ہے اور جموں و کشمیر کے مقامی اور عصری حوالوں کے ساتھ انہیں اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔

افسانہ" عبرت" مولوی باسط علی کے گرد گھومتا ہے جو ایک بنیاد پرست اور سخت مزاج آدمی

ہے۔اس کی بیٹی صبیحہ باپ کے طے شدہ رشتے کو ٹھکراتے ہوئے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔اور بغاوت پر آمادہ ہو کر سہیل کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے، جسے وہ چاہتی ہے۔مولوی باسط اس سازش میں اپنی بیوی کا ہاتھ دیکھتا ہے اور اس کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیتا ہے۔یہ حرکت مولوی کے بچوں کو ناگوار گزرتی ہے اور وہ سب گھر سے بھاگ کر ننہال میں اپنی ماں کے پاس چلے جاتے ہیں۔مولوی باسط اپنے کئے پر پچھتاتا ہے اور معززین کے سمجھانے پر بیوی کا حلالہ کروا کر اسے دوبارہ اپنی منکوحہ بنالیتا ہے۔یہ افسانہ ہمارے معاشرے پر ایک بھرپور طنز ہے۔

زنفر کھوکھر کے افسانے جموں وکشمیر کی سیاست، تاریخ اور سماجیات کا ایک منظر نامہ پیش کرتے ہیں اور عام فہم ہیں۔یوں تو لکھنا ایک شعوری عمل ہے لیکن لکھنے کی خواہش لاشعور میں پروان چڑھتی ہے اور الفاظ کے ذریعہ تخلیق بنتی ہے۔ادیب کی فنی بصیرت تخلیق کو نکھارتی ہے اور یہ فنی بصیرت گہرے مطالعہ کا تقاضا کرتی ہے۔یہ تقاضا زنفر کھوکھر صاحبہ سے بھی کیا جاتا ہے کہ وہ اردو کے کلاسکی افسانے کو اپنے مطالعے میں شامل کریں۔اس کے علاوہ آج اردو افسانہ کس مقام پر کھڑا ہے، دیگر زبانوں میں افسانے کی کیا صورت حال ہے، اس کا بھی جائزہ ضرور لیں۔میرے قریب زنفر کھوکھر ایک ذمہ دار اور باشعور ادیبہ ہیں اور ان میں اپنی کہانیوں کا احتساب آپ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔وہ از خود ہی اس امر کا جائزہ لے سکتی ہیں کہ ان کے کون کون سے افسانوں کے عنوان موضوع سے مطابقت نہیں رکھتے کیوں کہ افسانے کا عنوان ہی تخلیق کے مجموعی تاثر کو بیان کرتا ہے۔وہ یہ بھی دیکھ سکتی ہیں کہ کس افسانے میں فنی چابک دستی کی کمی ہے اور کس افسانے کی پیش کاری میں ان کی شبد شکتی نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔اس بات پر تو یقیناً وہ ایمان رکھتی ہوں گی کہ کلاسکی اور عالمی فکشن کا سنجیدہ مطالعہ کرنے سے بڑے بڑے اسقام رفع ہو جاتے ہیں۔

زنفر کھوکھر ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی ایسی نسائی آواز ہے جس کے تابناک مستقبل کے جملہ امکانات روشن ہیں اور مجھے امید ہے کہ ان امکانات کو یقینی بنانے کے لئے موصوفہ اردو افسانے کے طویل تر سلسلوں سے اپنا رشتہ استوار رکھیں گی اور اقدما کے کارناموں سے مستفیض ہونے والوں کی پہلی صف میں اپنی جگہ بنانے کے لئے تگ وتاز کا سلسلہ جاری رکھیں گی۔

☆☆☆

Zanfar Khokhar ki Afsanvi Duniya by Deepak Budki (Noida)

دیپک بدکی (نوئڈا)

# زنفر کھوکھر کی افسانوی دنیا

" خوابوں کے اس پار" سے لے کر" کانچ کی سلاخ" تک زنفر کھوکھر نے اپنے ادبی سفر کے دوران کئی سنگ میل طئے کئے ہیں۔زبان اور اسلوب پر ان کی گرفت ابتداء سے ہی نظر آتی تھی۔البتہ فکر و خیال میں پختگی اور بالیدگی وقت کے ساتھ ساتھ آتی گئی۔ان کے افسانوں میں رومانیت اور مقصدیت دونوں موجود ہیں اور مجھے یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ افسانہ ان کی سرشت کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔

زنفر کھوکھر ریاست جموں وکشمیر کے ایک دور دراز پس ماندہ علاقے ساج ،راجوری میں اردو ادب کی شمعیں جلائے بیٹھی ہیں اور محکمہء تعلیم سے تعلق رکھتی ہیں ۔یہ علاقہ جہاں اپنی فطری خوبصورتی کے لئے مشہور ہے وہیں سرحد کے قریب ہونے کے سبب ہمیشہ لرزاں اور پر فغاں رہتا ہے۔تقسیم ملک کے بعد اس علاقے نے کسی بھی دن امن چین سے سانس نہیں لی۔ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لڑائیوں کے دوران یہ دھرتی ٹینکوں اور گولہ بارود سے دہل اٹھتی ہے۔ہنستے کھیلتے گھر آنکھ جھپکتے ہی کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور لوگ راتوں رات اپنے گھر بار چھوڑ چھاڑ کر نقلِ مکانی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔دھرتی کے اس کرب کو زنفر نے نہایت ہی دقیقہ شناسی سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔اس کے علاوہ" عورت" بھی موصوفہ کے افسانوں کا غالب موضوع رہا ہے۔وہ عورت پر ہو رہے ظلم وستم ،ناخواندگی ،جہیز اور عدم تحفظ پر اکثر فوکس کرتی ہیں۔اس کے باوجود وہ نہ تو تانیثی تحریک سے وابستگی کا اظہار کرتی ہیں اور نہ ہی تانیثی آزادروی کے خواب دیکھتی ہیں زنفر کھوکھر کے افسانوں کا تیسرا اہم موضوع نظام تعلیم ہے۔وہ اپنے افسانوں میں اساتذہ اور تعلیم سے وابستہ منتظمین کو آڑے ہاتھوں لیتی ہیں۔

" خوابوں کے اس پار" زنفر کھوکھر کا پہلا مجموعہ ہے جس میں تیس افسانے شامل ہیں ۔حصہ اول کے چودہ افسانوں کا رنگ مزاحیہ ہے جبکہ حصہ دوم کے سولہ افسانوں کے موضوعات سنجیدہ ہیں ۔ان افسانوں کا جائزہ لیتے وقت مجھے اس بات کا ہر دم احساس رہا کہ زنفر مشرقی عورت ہونے کے

ساتھ ساتھ ایسے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں جہاں آزادی کے ساٹھ سالوں کے بعد بھی ماڈرن زندگی کی رمق دکھائی نہیں دیتی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس علاقے میں زندگی کی بنیادی ضروریات جیسے بجلی ، پانی، ہسپتال اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کالج اور یونیورسٹیاں بھی نہیں ملتیں۔ افسانہ نگار نے اس محدود ماحول میں رہ کر بھی خوبصورت افسانے رقم کئے ہیں جن میں ان کے مشاہدے سے زیادہ ان کے مطالعے کا عمل دخل ہے۔" خوابوں کے اس پار" پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہیر الدین لکھتے ہیں:

" یہ صحیح ہے کہ ابھی زنفر کھوکھر کی تحریر میں وہ مقناطیسیت تو پیدا نہیں ہوئی جس کے بغیر فن کار کو حیات دوام حاصل نہیں ہوتی لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اس مقناطیسیت تک پہنچنے کے لئے جس بنیادی جوہر کی ہر فن کار کو ضرورت ہوتی ہے، یعنی تخیل کی بے پایانی اور فکر کی جولانی یہ دونوں عناصر زنفر کے قلم کو قدرت نے قما حقہ عطا کئے ہیں"

مزاحیہ افسانوں میں زنفر کھوکھر نے عام زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے موٹے واقعات کے مزاحیہ پہلو ابھارے ہیں اور ساتھ ہی اپنے علاقے کی پس ماندگی ،لاچاری اور ضروریاتِ زندگی کی عدم موجودگی کو ہدف ملامت اور اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ افسانہ" مدہوش" میں وہ پبلک ٹرانسپورٹ کے پابندی سے نہ چلنے کے سبب ہمیشہ آفس دیر پہنچتی تھیں اور ایک روز جلدی پہنچنے کے چکر میں خواب میں اغوا ہو جاتی ہیں۔" گھر پیارا گھر" میں کرائے پر گھر نہ ملنے کے باعث اپنے آپ کو شادہ شدہ ظاہر کرتی ہیں مگر یہ جھوٹ بھی کام نہیں آتا کیوں کہ نئے مکان مالکن شادی شدہ لوگوں کو اپنا گھر کرائے پر دینا پسند نہیں کرتی۔" انتخاب" میں عورتوں کا تعاقب کرنے اور ان سے بد سلوکی کرنے ،" ہم ہندوستانی ہیں" میں حب الوطنی،" یوں بھی ہوتا ہے" میں اسکول دیر سے پہنچنے ،" نصیحت" میں سررشتہء تعلیم کے انتظامیہ کے دوغلے رویے،" جوابی کاروائی" میں تعلیم یافتہ بیوی کے آگے ان پڑھ تاجر کا احساس کمتری میں مبتلا ہو کر دوسری شادی کرنے ،" ہمارے ماسٹر جی" میں استاد طبقے کو اپنی ذمہ داریاں سمجھنے ،" عزت کا سوال" میں عورتوں پر ہو رہے مظالم کا جائزہ لیتے ہوئے ایک اخباری رپورٹر کا مردوں پر ہو رہے ظلم کا چشم دید گواہ بننے ،" چکری" میں ایک دیانت دار استاد خود کو سماج میں الگ تھلگ پانے ،" اہلیہ محترمہ" میں آدمی کا شادی کر کے بیڑیوں میں بندھ جانے ،" پہلی ہی نظر میں" میں باغی لڑکی کو اپنے عاشق کے ڈھونگ کا پتہ چلنے ،" گزشتہ راصلوٰۃ" میں حاضری رجسٹر کے غائب ہو جانے اور پھر اپنے ہی کاغذوں کے مل جانے کے درمیانی وقفے میں ہیڈ ماسٹر کی حواس

باخنگی اور" پرنسپل صاحب" میں انتظامیہ کی جانب سے مردوں کو عورتوں پر ترجیح دینے کو موضوع بنایا گیاہے۔

"خوابوں کے اس پار" فکر انگیز افسانہ ہے جس میں ایک باپ شہوت کے زیر اثر اپنی ہونے والی بہو کو نہایت چالبازی کے ساتھ اپنی بیوی بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔خونی رشتوں کی شکست و ریخت پر لکھا گیا یہ بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے جس کو پڑھ کر مجھے اسٹار ورلڈ کے ایک سیریل" بولڈ اینڈ بیوٹی فل" کی یاد آتی ہے۔اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شہوت پرستی اور اشتعال انگیزی صرف مغربی تہذیب کی میراث نہیں ہے بلکہ مشرق میں بھی پردے کے پیچھے پروان چڑھتی رہی ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ مغربی تہذیب کی بدعنوانیاں غیر مشروط میڈیا اور ادب کے ذریعے کھل کر سامنے آتی ہے جبکہ مشرقی تہذیب میں پل رہی گندگی دبیز تہوں کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔وہ چاہے امرد پرستی ہو یا ترویج محرمات(Incest)،ایزارسانی ہو یا درز بینی (Voyeurism)۔اس افسانے میں احساس گناہ اور تحفظ خود باپ کو آتش زیر پا رکھتا ہے مگر اس کا فرمانبردار بیٹا رشتوں کی لاج رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا جس کے باعث شکیل کی وفات کے بعد اس کی نئی ماں یوں گویا ہوتی ہے۔

"شکیل تم نے مجھے ماں کا رتبہ دے کر میرے سارے خوف اور اندیشے دور کر دیے تھے۔تم نے میرے بچوں کو اپنے سگے بھائی کہہ کر مجھے مستقبل کی انجانی فکروں سے آزاد کر دیا تھا۔شکیل ہمیں تمہاری ضرورت تھی۔"

دیگر افسانوں کے موضوعات بھی ہم عصری مسائل پر مبنی ہیں ۔افسانہ" ایک چھوٹی سی لڑکی" میں معشوقہ سے مراجعت،" بےبسی" میں نیچی ذات کی لڑکی سے شادی نہ کرنے کے سبب عمر بھر اسے یاد کرنا،" دردنہاں" میں ایسی لڑکی سے انتہائی محبت کرنا جو شادی شدہ ہے،" تشویش" میں ایک دلیر لڑکی راحیلہ کا طلاق شدہ ثاقب کو سیکنڈ ہینڈ مرد کہہ کر ٹھکرا دینا،" گھر" میں نقل مکانی اور بے زمینی کا کرب،" بڑی بہو" میں عورت کو بانجھ ہونے کے سبب گھر سے نکال باہر کرنا،" رعایت" میں نسوانی آزادی اور ریزرویشن بل کی ضرورت۔" نسخہ" میں متنازعہ موضوع کی آڑ میں قلمکاروں کا شہرت حاصل کرنا،" وہ" میں بچہ نہ ہونے کے باعث طلاق ہونا،" دربہ" (ڈربہ) میں گھر سے نکالے جانے پر نادرہ کا اپنے پرانے بوسیدہ کمرے میں پناہ لینا،" حسن سلوک" میں بہو کا اپنی ساس سے تنخواہ کی مانگ کرنا اور بدلے میں ساس کا اپنی ساری رقم اس کے حوالے کر دینا،" ایس ٹی" میں ریزرویشن کا

مسئلہ ۔"ایک انسان" میں انسان کے چہرے سے نقاب ہٹا کر اس کا اصلی روپ سامنے لانا،" پچھتاوا" میں ایک معصوم لڑکی کو چھلاوے سے اپنے گونگے بہرے بھائی سے شادی کروانا اور " ائے جان ناتواں" میں مردوں کی دنیا میں عورتوں کی بے بسی و لاچاری۔غرض یہ کہ زنفر کھوکھر نے اپنے گردوپیش کو کھنگال کر ہی افسانے رقم کئے ہیں۔

زنفر کھوکھر کا دوسرا مجموعہ بعنوان" کانچ کی سلاخ" چار سال کے وقفے کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔اس مجموعے کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ زنفر کھوکھر نے ادبی میدان میں ایک لمبی چھلانگ لگا کر منزل کو پانے کی کوشش کی ہے۔زبان،اسلوب اور ٹریٹمنٹ،سبھی پہلوؤں میں فنی پختگی کا احساس ہوتا ہے ۔مشاہدے میں گہرائی ،مطالعے میں وسعت اور موضوعات میں سنجیدگی صاف نظر آتی ہے۔حالانکہ اس مجموعے میں سترہ (17) سنجیدہ افسانوں کے علاوہ نو مزاحیہ افسانے بھی شامل اشاعت ہیں مگر ان افسانوں میں بھی عصری مسائل کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔یہاں میں زنفر کھوکھر کو اپنی رائے دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں ۔مزاحیہ واردات ، واقعات یا لطیفے افسانے نہیں بن سکتے۔افسانے میں سنجیدہ فکر وخیال کا ہونا لازمی ہے۔بذلہ سنجی افسانے کی منزل نہیں بن سکتی،صرف منزل تک پہنچنے کے لیے مدد کرسکتی ہے۔کرشن چندر نے نہ تو اپنے افسانوں کو لطیفہ بنانے کی کوشش کی اور نہ ہی مزاحیہ خاکہ۔اس کے برعکس انہوں نے طنز کے تیروں سے معاشرے پر بھرپور وار کئے اور یہی ان کی مقبولیت کا راز بھی ہے۔افسانہ نگار کو چاہئے کہ وہ مزاحیہ خاکوں اور مضامین کو الگ سے شائع کروائیں۔" کانچ کی سلاخ" کے دیباچے میں امین بنجارہ یوں رقم طراز ہیں:

" زنفر کھوکھر نے اپنے گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات کا اثر قبول کر کے اور اچھے برے لمحوں کے کھیل تماشوں کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے انسانی فطرت کے رموز واسرار کی گرہوں کو کھولنے کی جو سعی کی ہے، وہ قابل تعریف ہے۔اصل میں لمحوں کے کھیل تماشے ہی ان موضوعات کو جنم دیتے ہیں جن پر فن کار اپنے فن کی بنیاد رکھتا ہے۔زنفر کھوکھر اس بات کی قائل نہیں ہیں کہ انسان رنج و غم کے حصار میں مقید ہو کر رہ جائے یا پھر کسی بھی مسئلے کو اپنی جان کا روگ بنالے۔وہ پل پل ٹوٹنے اور بکھرنے کے بجائے خوشحال ، پرسکون اور آزاد فضاؤں میں سانس لینے کو ترجیح دینے کا پیغام دیتی ہیں، بھلے ہی اس عمل کے دوران میں جگ ہنسائی اور طعن وتشنیع سے دوچار ہونا پڑے۔یہ زنفر کے فن کا رجائی پہلو ہے۔قنوطیت اور یاسیت سے انہوں نے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔"

مذکورہ کتاب کا پہلا افسانہ" سیکنڈ ہینڈ" پہلے مجموعے میں بھی شامل ہے۔افسانہ" خواب"

کی زاہدہ بیگم بچوں کی بے انتہا لالچ اور خودغرضی دیکھ کر اپنی دولت غریبوں میں بانٹتی ہے۔" کانچ کی سلاخ" نفسیاتی افسانہ ہے اور لگتا ہے اس کا ہیرو نواز علی کہیں نہ کہیں افسانہ نگار سے ملا ہوا ہے۔اس افسانے میں فوجی ڈسپلین کا گرویدہ نواز علی اپنے گھر میں بھی ڈسپلین کا خواہاں ہے مگر اپنی بیوی صدیقہ جان کو قابو کرنے میں ناکام ہوتا ہے۔وہ جتنی بھی پابندیاں لگانے کی کوشش کرتا ہے،صدیقہ اتنی ہی بپھر جاتی ہے۔اس گھریلو تنازعہ سے فائدہ اٹھا کر ان کا بیٹا بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے اور ملی ٹینٹ بن کر حب ولوطن اور نیک سیرت نواز علی کے منہ پر کالک پوت کر اسے راہ عدم اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔افسانہ" حادثہ" میں ماں کی ممتا کے باعث اس کا بیٹا بگڑ جاتا ہے اور دونوں کے درمیان خلانمودار ہوتا ہے۔" یہ دنیا اگر مل بھی مجائے تو کیا ہے" میں ڈرپوک بیٹا ماں باپ کے کہنے پر محبوبہ سے کنارہ کر کے دوسری لڑکی سے شادی تو کر لیتا ہے مگر لاشعور میں اسی کو بسائے رکھتا ہے۔" خاموشی" کہانی ہے ایک بانجھ عورت کی جو اٹھتے بیٹھتے اپنی جیٹھانیوں کے طعنے سنتی رہتی ہے اور ایزا پسند عورت کی طرح اپنے آپ کو یوں تسلی دیتی ہے" وہ کیا جانیں کہ قدرت نے ستم سہنے میں بھی ایک مزہ چھپا رکھا ہے۔" اسی طرح" یادیں" نفسیاتی الجھن میں پھنسی مامی عذرا کی کہانی ہے جو شوہر کی بے توجہی کے سبب چھ بچے جن کر بھی ہر ایرے غیرے کو اپنے دکھڑے سناتی رہتی ہے اور آخر کار اپنے بچوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی ہے۔

زنفر نے دیہاتی لوگوں کی معصومیت اور سادگی کو افسانہ" پانچ سو روپئے" میں بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔اس افسانے میں ڈاکٹر ایک ایسی عورت کی سادگی اور ناخواندگی کا فائدہ اٹھا کر اس سے ایک سو روپئے کے بجائے پانچ سو روپئے اینٹھ لیتی ہے اور ساتھ ہی ناک چڑھا کر گویا ہوتی ہے ۔" تم دیہاتی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہو، کام نکلوانے کے بعد ذلالت پر اتر آتی ہو۔میں تم سب دیہاتیوں کو بہتر طور پر جانتی ہوں۔"

" مجبوری" سماجی بدعتوں پر لکھا گیا خوبصورت افسانہ ہے۔راوی پڑوسی کی بیٹی کی شادی پر فضول خرچیوں کے لئے روپیہ دینے سے انکار کرتی ہے مگر وقت ضرورت اسی پڑوسی کی بہو جو حاملہ ہوتی ہے، کی جان دو ہزار روپئے دے کر بچاتی ہے۔" پارٹنرشپ" میں لیاقت علی ایک تنک مزاج لڑکی سے لو میرج کر لیتا ہے مگر بعد میں اس سے چھٹکارا چاہتا ہے جس کے لئے اس کا بزنس پارٹنر اس کی مدد کرتا ہے۔" کچھ نہیں" میں خوش مزاج نازیہ کو اس کے والدین کم پڑھے لکھے بے روزگار کے پلے باندھ دیتے ہیں مگر وہ اپنے شوہر کی کمزوریوں کے بدلے اس کی خوبیوں کے سہارے زندگی جی لینے

میں کامیاب ہوجاتی ہے۔" بندھن" کہانی ہے ایک بیوہ کی جو اپنے مرے ہوئے شوہر کو اتنا چاہتی ہے کہ دوسری شادی کے تصور سے ہی ذہنی اختلال کا شکار ہو جاتی ہے۔" بھول بھلیاں" میں سمدھی بھی ایک دوسرے سے سچائی چھپاتے ہیں اور سارا قصور شادی کروانے والے کے سر منڈھتے ہیں۔" انجام " ایسا افسانہ ہے جس میں ایک لڑکی کے گھر چھوڑ کر اپنے عاشق کے ساتھ بھاگنے سے گھر کی تباہی کی منظر کشی کی گئی ہے جبکہ افسانہ" فیصلہ" کثیر الازدواجی زندگی کی صعوبتوں پر لکھا گیا ہے۔" سمجھوتہ" میں اپنے باپ، خاوند اور بیٹے سے دھوکہ کھا کر سعدیہ اکیلی زندگی سے لڑتی ہے۔" تلقین" میں فریدہ اپنی امی کی خرابیٔ صحت کی خبر پا کر ان کے پاس پہنچنے کے لئے ایک اجنبی سے لفٹ لینے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے اور آبرو بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔

مزاحیہ کہانیوں میں" باتیں کچھ راتوں کی" میں گھر کے مکینوں کو رات بھر ملی ٹینٹوں کا کھٹکا رہتا ہے جب کہ صبح وہ دروازے پر کتے کو دیکھتے ہیں۔" خود کردہ را چارہ نیست" ان بوڑھے قلمکاروں پر طنز ہے جو اپنی تحریروں کے ساتھ جوانی کی تصویریں چسپاں کرتے ہیں۔" سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا" ان عاشقوں پر طنز ہے جو ہر اس لڑکی کو معشوق سمجھ بیٹھتے ہیں جو ان کے ساتھ ہنس کر بات کرتی ہیں مگر آخرش بھائی بناتی ہے۔" آس کا دامن" کالی صورت مگر اجلی سیرت والے آدمی کی کہانی ہے کہ آخر کار اس کی بیوی کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ" دراصل کچھ لوگ اندر سے نہایت ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔"

" صندوق" میں ایک حکایت کو افسانہ بنایا گیا ہے۔ افسانے میں ایک بوڑھا آدمی اپنے ٹرنک میں بڑا سا تالا لگا کر رکھتا ہے اور گھر کے سبھی فرد اس ٹرنک کی وجہ سے اس کی خوب خاطر داری کرتے ہیں جب کی اس ٹرنک میں کوئی قیمتی شئے نہیں ہوتی۔ مزاحیہ افسانوں میں جو بہترین افسانہ رقم کیا گیا ہے وہ ہے" حکم نامہ"۔ اس افسانے میں ملی ٹینٹوں کے لیڈر حکم نامہ جاری کرتے ہیں جس کی رو سے ہر عورت کو برقعہ پہننا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ راوی کو اس بات کی حیرت ہوتی ہے کہ رات بھر میں ہی ہر دوکان میں برقعے کیسے دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ سوچتی ہے کہ اس میں ان لیڈروں اور تاجروں کی کوئی سازش تو نہیں ہے۔" ریزرویشن" میں نسوانی آبادی کے لئے ریزرویشن کی ضرورت ،" خواب نہیں دیکھا کرو" میں خواب دیکھنے کی حماقت اور" گالی" میں کلام کی حسن کاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔

زنفر کھوکھر اپنے افسانوں کی شروعات بڑے ہی دلکش انداز میں کرتی ہیں۔ پہلے ہی جملے

سے قاری افسانہ پڑھنے کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔اس ضمن میں دو افسانوں سے اقتباسات یہاں پر درج کرر ہا ہوں:

" سیما ایک بوجھ تھی مجھ پر، ایک ناپسندیدہ بوجھ، جسے اٹھائے رکھنا میری مجبوری تھی۔میری گھریلو اور خاندانی مجبوری اور پھر سماجی مجبوری۔چونکہ میں منحرف نہیں تھا، روایات شکن نہیں تھا۔سماجی قواعد و ضوابط اور رسم و رواج کا قدردان تھا۔" (یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے)

" میرے یہ پوچھنے پر کہ آپ کے" وہ" کیا ہیں۔۔؟ نازیہ صاحبہ نے سر اٹھا کر" کچھ نہیں" اس انداز سے کہا جیسے کہہ رہی ہوں کہ" وہ سب کچھ ہیں" سی۔ایم ہیں بلکہ پی۔ایم صاحب ہیں۔" ( کچھ نہیں)

کردار نگاری میں بھی زنفر ید طولیٰ رکھتی ہیں۔انہوں نے اپنے آس پاس کے ماحول سے ہی کردار ڈھونڈ نکالے ہیں۔کئی افسانے تو ایسے ہیں کہ ان کی اپنی زندگی سے وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔اس بارے میں امین بنجارہ فرماتے ہیں:

" کردار نگاری کے حوالے سے زنفر کھوکھر کے افسانے بڑے جاندار ہیں کیوں کہ ان کے کردار اپنی اپنی ذات کے ٹوٹنے اور اپنی ذات کے کرب کی نمائندگی کرتے ہوئے قاری کو کبھی کبھار اپنے سینے پر ہاتھ رکھنے کو مجبور کر دیتے ہیں۔قاری کو کئی بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زنفر کھوکھر نے اس کے دل و ذہن میں جھانک کر ہی یہ کردار صفحہءقرطاس پر اتارا ہے۔صائمہ" نواز علی" صدیقہ جان، نازیہ، زاہدہ بیگم، ثاقب، بڑی بیگم، شاہنواز، لیاقت علی، بی اماں، راشد اور چھوٹی بیگم کے کردار ہمارے دیکھے ہوئے کردار ہیں جو خارجی اور داخلی سطح پر اپنا کرب ابھارتے چلے جاتے ہیں۔"

کئی افسانوں میں زبان کی غلطیاں در آئی ہیں۔البتہ یہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔مثلاً صفحہ 60 پر بتیا چار(اتیا چار) صفحہ 121 پر پچھلی کھڑکی (پچھلا دروازہ) صفحہ 141 پر اچٹکتی (اچٹتی) صفحہ 155 پر مزاح (مذاق) اور صفحہ 157 پر دربے (ڈربے) ہونا چاہئے۔ان اغلاط کا تعلق مجموعہ" خوابوں کے اس پار" سے ہے۔" کانچ کی سلاخ" میں صرف دو تین غلطیاں نظر آتی ہیں، جیسے نظر ہو چکے (نذر ہو چکے) صفحہ 90 وغیرہ۔ان اغلاط سے قطع نظر زنفر کھوکھر کی تحریریں قاری کو باندھنے میں کامیاب ہوتی ہیں اور عبارت کی دلکشی شروع سے اختتام تک برقرار رہتی ہے۔سرحد کے قریب رہنے کی وجہ سے زنفر کی تحریروں میں بے گھری اور بے زمینی کا کرب جا بجا ملتا ہے۔ملاحظہ کیجئے چند اقتباسات:

"اس کی پھیکی سی ہنسی بے وجہ کب تھی۔ابھی ابھی تو اسے پتہ چلا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔اس کی طرح

کوئی اور بھی ہے کہ مکان بنانے میں جس کے زیورات تک بک گئے ہیں۔ نہ جانے اور بھی کتنے ہوں گے۔۔۔ بلکہ سب ہی ہیں۔ مکان یوں نہیں بن جاتے ہیں۔ مکان بنانے میں عمر لگتی ہے اور عمر بھر کی پونجی لگتی ہے۔ تب کہیں جا کر ہنستے بستے گھر وجود میں آتے ہیں۔" آہ ہم لٹ گئے۔ ہم تباہ و برباد ہو گئے۔۔۔" اب آوازیں ہی آوازیں تھیں اور موضوع ایک تھا۔" ( گھر، ص 135 )

" بیٹی ! دونوں جنگوں میں ہمارے بھرے پورے گھر جلا دیے گئے اور تمہیں بتاؤں کہ جلایا کس نے۔۔! آہ اپنے ہی ملک کی فوجوں نے، محض اس شک میں کہ ان گھروں میں دشمن کی فوجوں نے پناہ لے رکھی ہے۔ ہمارے پاس کشادہ مکان تھا۔ زندگی آرام سے گزر رہی تھی کہ 1947 کا غدر پھوٹ پڑا اور ہمیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا پڑا۔ ہم سات سال تک مہاجر بنے رہے۔ وطن کی کشش ہمیں واپس کھینچ لائی مگر ہم نے آ کر کیا دیکھا، ہمارے گھر کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ہم نے پھر دن دیکھا نہ رات اور پھر سے مکان بنایا۔ ابھی سکھ کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ سال 1965 آ گیا اور ہم پھر اجڑ گئے۔" ( گھر، ص، 135 )

" بہو، ہم لوگ ہند و پاک کی جنگوں کے مارے ہوئے ہیں۔ ہمارے مکان دو بار جلائے گئے۔ 1947 میں بھی اور 1965 میں بھی۔ ہندوستانی فوجیوں نے اس لئے جلائے کہ ان گھروں میں پاکستانی فوجیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا اور پاکستانی فوجیوں نے اس لئے جلائے کہ یہ ہندوستانیوں کے گھر تھے۔" ( گھر )

محولہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں کو ہمیشہ عدم تحفظ اپنی دھرتی اور اپنی مٹی کا کھو جانا اور زندگی کا عبوری پن ستاتا رہتا ہے، جس کے باعث ان کا نفسیاتی رد عمل بھی دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ زنفر نے اپنے کرداروں کے ذریعے اس نفسیاتی کرب کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ آخر میں زنفر کھوکھر کے افسانوں کے بارے میں جگن ناتھ آزاد کی رائے پیش کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں:

" زنفر کھوکھر صوبہ جموں کی ایسی خاتون افسانہ نگار ہیں جنہیں کہانیوں کی بنت کا فن آتا ہے۔ زنفر کھوکھر کے افسانوں میں محسوسات کے کئی پرتو دکھائی دیتے ہیں جو اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ وہ زندگی کے ہر ایک پہلو پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور زندگی سے وابستہ گوناگوں مسائل پر غور و فکر کرتا ہوا ذہن ان کے پاس موجود ہے۔"

☆☆☆

Urdu Adab ki Goonjti Garajti Afsanvi Awaz by Ashraf Mahmood Nandan

اشرف محمود نندن

# اردو ادب کی گونجتی گرجتی افسانوی آواز

زنفر کھوکھر اردو ادب کے افق پر ابھرنے والی ایک منفرد اور موثر آواز ہیں۔ جموں و کشمیر کی دور افتادہ سنگلاخی زمین سے انہوں نے اپنے تخلیقی شعور اور اظہار کے ذریعے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا ہے۔ اردو ادب میں ماضی قریب میں خواتین ادیبوں کی ایک خاطر خواہ تعداد موجود رہی ہے جنہوں نے نسوانی احساسات کے نقطہء نظر سے عوامی زندگی کو اپنے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے بعد خواتین کی ایک بڑی تعداد نے اردو فکشن میں اپنے گہرے نقوش ثبت کئے ہیں ۔موجودہ دور میں بھی بہت ساری خواتین افسانوی ادب میں اپنی تخلیقات کے شہہ پارے صفحہء قرطاس پر رقم کر رہی ہیں جو اس بات کی غماز ہیں کہ عورت اب پس پردہ بے بسی کی حالت میں نہیں ہے بلکہ عورت اب دنیا سے آنکھ ہی نہیں ملاتی بلکہ بہ نظر غائر اس تک رسائی حاصل کر کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کرنے کی جراءت رکھتی ہے۔

زنفر کھوکھر بھی انہیں بے باک اور نڈر خواتین میں سے ہیں۔انہوں نے اپنے احساسات، جذبات اور مشاہدات کو صرف اپنے تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اپنے ادب پاروں میں ڈھال کر پوری اردو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔انہیں جہاں کہیں بھی کوئی کمی بیشی یا کوئی ہیرا پھیری نظر آئی انہوں نے اسے شہہ پارے میں ڈھال دیا تا کہ اصلاح معاشرہ ہو سکے۔

زنفر کھوکھر نے طنز و مزاح ،انشائیہ اور افسانوی ادب میں کثرت سے طبع آزمائی کی ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے بعض تلخ حقائق اور مسائل کو بڑی صاف گوئی سے پیش کیا ہے۔وہ بے جا طوالت سے گریز کرتی ہیں۔افسانے کی تشکیل میں ہیت اور وحدت تاثر پر ان کی خاص توجہ رہتی ہے۔انہوں نے مختلف النوع مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ہر ادیب کا اپنا مزاج، ماحول اور انداز بیان ہوتا ہے جو کہیں نہ کہیں اس کی نگارشات میں در آتا ہے۔زنفر کھوکھر کا بھی اپنا ایک منفرد انداز بیان ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے قاری کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتے ہیں۔ان کے افسانوں کا جہاں کتنے ہی حالات و واقعات کی روداد اپنے اندر

سمیٹے ہوئے ہے۔ان کے افسانوں کے مطالعے سے ذہن ودل کوایک نئے فہم وادراک کا احساس ہوتا ہے۔

راقم الحروف کی ادارت میں پنجاب سے شائع ہونے والے اردو رسالے" پرواز ادب" میں زنفر کھوکھر کے متعدد افسانے بھی خوب سے خوب تر کی مثال ہیں۔قارئین ان کے مطالعے سے زندگی کے مختلف رنگوں اور تجربوں سے مرتب ہونے والے اثرات کو محسوس کریں گے۔میں زنفر کھوکھر کو اس تازہ کاوش کے لئے دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں۔اور یہ توقع بھی رکھتا ہوں کہ ان کی تخلیقی صلاحیت سے متاثر ہو کر د

☆☆☆

Zanfar Khokhar ke Afsane by Mohd. Shahid Pathan cell- 9372843907
محمد شاہد پٹھان

# زنفر کھوکھر کے افسانے

زنفر کھوکھر ریاست جموں وکشمیر کی ایک سنجیدہ (Mature) ادیبہ ہیں۔انھوں نے گذشتہ تین دہائیوں میں اپنی تخلیقات سے قارئین کو متوجہ کیا ہے۔ضلع راجوری کے ایک چھوٹے سے موضع 'ساج' میں سکونت پذیر اس خاتون افسانہ نگار نے معاصر زندگی کے پیچ وخم اور سیاستِ وقت کے پیدا کردہ مسائلِ حیات کو فن کارانہ ژرف نگاہی سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔وہ بے وجہ اور بے مقصد لکھنے کی قائل نہیں ہیں۔زنفر نے اپنے افسانوں اور انشائیوں میں زندگی کے تلخ اور حقیقت آمیز مسائل ومعاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی مؤثر سعی کی ہے۔عصری زندگی کے سیاسی وسماجی خلفشار، تضادات اور تفکرات کے ساتھ ہی زنفر نے انسانی نفسیات اور خاص کر نسوانی مسائل پر توجہ مرکوز کی ہے۔میرے خیال سے ایک افسانہ نگار اور انشائیہ نگار کو انسانی نفسیات کا رمز شناس ہونا لازمی ہے۔زنفر کھوکھر کے افسانوں میں نسوانی مسائل کے ساتھ ہی تانیثیت (Feminism) کا رجحان نمایاں ہے۔انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں ارضی ومضافاتی مسائل مثلاً: آتنک واد (Terrorism) جہاد (Holy War) رشوت (Gratification) اور نسوانی تشدد (domestic violence) بے میل شادی (Mismatched-Marriage) وغیرہم کو خصوصیت کے ساتھ نشان زد کرنے کی سعی کی ہے۔افسانوں کی طرح زنفر کھوکھر نے انشائیوں میں بھی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں پر (طنز ومزاح کے پیرائے میں) روشنی ڈالی ہے۔وہ سماج ومعاشرے کے چھوٹے چھوٹے اور ہلکے پھلکے تجربات و محسوسات کو اپنے انشائیوں کی شگفتہ بیانی کا حصہ بنانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

زنفر کھوکھر مدرسی کے پاکیزہ پیشے سے وابستہ رہی ہیں۔استاد اور ٹیچر دراصل ہمارے سماج کا مہذب و مانوس فرد ہوتا ہے۔وہ اپنی فکر اور طرزِ عمل سے پورے معاشرے کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔زنفر کھوکھر کے متعدد افسانوں کے کرداروں کے مکالمات و بیانات میں 'استانی موصوفہ' کے اپنے مثبت خیالات ومسلمات اور تاثرات کا اظہار بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔مثلاً: چند افسانوں کے درجِ ذیل اقتباسات دیکھیے:

''نواز علی مخلص تھے، ان کا ظاہر و باطن ایک تھا، وہ بہت اچھے تھے۔ ان کے پاس سب کچھ تھا وہ کسی کو بہت کچھ دے سکتے تھے، ہدایتیں، نصیحتیں اور سزائیں۔۔۔ مگر ان کے پاس پیار نہیں تھا۔ وہ کسی کو پیار نہیں دے سکتے تھے۔ وہ بیوی کو بھی پیار نہیں دے پاتے تھے۔ انھوں نے اُسے ہمنوا بنانے کے لیے پیار کا پریوگ نہیں کیا تھا۔ اگر کیا بھی تھا تو بہت کم۔۔۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اوروں کی نسبت بیوی کو کہیں زیادہ مقدار میں پیار کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (کانچ کی سلاخ۔ص:۵۰)

''آدمی اگر گھر سے مطمئن اور خوش حال ہو تو وہ باہر کی تلخیوں کو کچھ حد تک بخوشی برداشت کر لیتا ہے۔ اپنی سوچ اور عمل کو مثبت اور تعمیری انداز میں ڈھال سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر اس کی سوچ اور عمل نہ چاہتے ہوئے بھی منفی اور تخریبی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔۔۔ (پارٹنر شپ)

''میری بہن! ابو کا نظریہ صحیح تھا۔ عارف کا خاندان واقعی اچھا نہیں تھا۔ وہ اگر اچھے خاندان کا ہوتا تو تمھیں یوں بھگا کر ہرگز نہ لے جاتا۔ اب ایک ایک کر کے اس کی برائیاں تمھیں نظر آتی رہیں گی اور آج نہیں تو کل ضرور تم اپنے کیے پر پچھتاؤ گی۔ کیوں کہ دوسروں کو اذیت دے کر حاصل کی گئی خوشیاں دیر پا نہیں ہوتی ہیں۔'' (انجام)

''انسان کی خوب صورتی اس کا اخلاق اور کردار ہے۔ میں ظاہری خوب صورتی کی بالکل قائل نہیں ہوں۔'' (تلقین)

''اکثر باپ وراثت میں اپنی اولادوں کے لیے جاگیر کے ساتھ ساتھ بہت سارے جھگڑے بھی چھوڑ جاتے ہیں۔'' (دو حکمران)

''یہ خیال اکثر اسے رُلا دیتا ہے کہ اب اس کے گھر میں کسی سفید ریش بزرگ کا وجود نہیں ہے۔ اب وہ (صائمہ) سردی اور گرمی کے احساسات سے بے نیاز تھی۔ اگر احساس تھا تو محض ایک پچھتاوے کا۔ اپنے گھر سے اس بزرگ ہستی کے چھن جانے کا۔'' (آہ)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زنفر کھوکھر کے متعدد افسانوں میں ان کے اندر کی معلمہ اپنے انسانی و اخلاقی تصورات و ترجیحات کا اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اپنے گرد و پیش کے سماج و ماحول

میں پھیلے ہوئے بے شمار موضوعات و مسائل کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع و مبحث بنایا ہے۔مسلم معاشرے کی متاہلانہ (ازدواجی) زندگی کے متضاد اور مبارزت خیز معاملات کے بیان میں زنفر کھوکھر نے فن کارانہ دیانت داری کا ثبوت پیش دیا ہے۔

انھوں نے جہاں ایک طرف اقلیتی معاشرے میں بے میل ہونے والی شادیوں کے بروئے کار آنے والے برے نتائج کی نشان دہی کی ہے وہیں گھریلو زندگی میں عورتوں کی بدمزاجی، کم عقلی، کج ادائی کے باعث ابھرنے والے مسائل کا بھی بے کم وکاست بیان کیا ہے۔ازدواجی زندگی میں پیش آنے والے بہت سے تلخ وترش واقعات وسانحات کا ذمے دار، مصنفہ نے مرد کے ساتھ ہی عورت کو بھی ٹھہرایا ہے۔مثلا: افسانہ ''پارٹنرشپ'' کے دو کردار شاہ نواز اور لیاقت علی دونوں کی بیویاں تنک مزاج اور غصیل ہیں۔دونوں افراد اپنی اپنی بیویوں سے انتہائی پریشان ہیں۔لیاقت علی کی بیوی 'سیما' کا نقشہ افسانہ نگار نے کچھ اس طرح کھینچا ہے:

''لیاقت علی اس روز واقعی غمگین تھا۔رات بھر کے ہنگامے کے بعد اس کی بیوی آج پھر اسے چھوڑ کر ڈراتی دھمکاتی ہوئی مائکے چلی گئی تھی جس کا مطلب تھا کہ اب وہ ہفتوں واپس نہیں آئے گی، وہ سسرال بیوی کو منانے آئے گا تو بیوی کی ماں اس کی جان کھا جائے گی۔۔۔اور اگر سیما اماں کے ساتھ آ بھی جاتی ہے تو تھوڑے عرصے بعد ناراض ہوکر واپس چلی جائے گی۔سارا جھگڑا کام ہی کام کا ہے۔سیما ہمیشہ کی طرح کہے گی:''میں نے تم سے پیار کیا ہے، کام کا سوال نہیں'' اور اماں کہیں گی:''بہو بیٹیاں کام کرتی ہی اچھی لگتی ہیں۔''

سیما کا الگ ہونے کا مطالبہ زور پکڑے گا اور یہیں ان دونوں کے درمیان بحث وتکرار چھڑ جائے گی جو جھگڑے اور ناراضگی کے بعد سیما کے مائکے روانگی پر ختم ہوجائے گی۔''

شاہ نواز نامی کردار بھی اپنی بیوی کی سخت مزاجی سے ملول ہے۔وہ اپنے بزنس پارٹنر لیاقت علی سے اپنے گھر کے حالات اور اہلیہ کی بدنہادی کا رونا روتے ہوئے اپنا دکھڑا کچھ اس طرح سناتا ہے:

''ایسی ہی ایک بیوی کو میں گزشتہ بائیس سال سے جھیل رہا ہوں۔تمھاری بیوی میری بیوی کی ڈپلی کیٹ نہیں بلکہ اصل کاپی ہے۔ایسی عورتیں گنی چنی ہوتی ہیں مگر ہوتی ضرور ہیں۔مرد کو اپنا ماتحت بنائے رکھنا پسند کرتی ہیں۔گونج گرج کر بولتی ہیں، پائی پائی کا حساب لیتی ہیں۔بات نہ ماننے کی صورت میں زہر تک کھا لینے کی دھمکی دیتی ہیں۔ایک معاملہ طے کرو تو دوسرا کھڑا کر دیتی ہیں۔روٹھ جاتی ہیں تو منائے

نہیں مانتی ہیں۔ان کا بس چلے تو مرد کی ۔۔۔۔۔تک ڈالتی ہیں اور اسی میں اپنی دانائی اور قابلیت سمجھتی ہیں۔وہ اوروں کو یہ دکھانا پسند کرتی ہیں کہ ان کا شوہر ان کے اشاروں پر ناچتا ہے۔''

لیاقت علی کی پریشانی کا حل افسانہ نگار نے ''طلاق'' کے ذریعے نکالا ہے۔اپنے بزنس پارٹنر شاہ نواز سے لیاقت علی اپنی بیوی سے گلوخلاصی کی روداد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میں اسے منا کر لانے کو گیا تھا مگر وہ میرے سامنے ہی نہیں آئی اور اس کی ماں نے مجھے معمول کی طرح ڈانٹ ڈپٹ کی۔میں سمجھ گیا کہ یہ کڑھی پکے گی نہیں۔مائیں تو اپنی بیٹیوں کو ہدایت دیتی ہیں مگر جو ماں اپنی بیٹی کے غلط مطالبوں کی حمایت کرے وہ بیٹی کبھی اچھی نہیں بن سکے گی۔بس میں گھر آیا اور 'سیما' کو طلاق نامہ بھیج دیا۔''

''شاہ نواز کو یوں لگا جیسے کہ ان کا آدھا غم دور ہو گیا ہے کہ انھوں نے لیاقت علی کو ایک روگ سے بچا لیا۔انھوں نے چہک کر کہا:''تم مجھ سے کہیں زیادہ عقل مند نکلے۔۔۔تم نے بازی جیت لی۔تم نے بہت خوب کیا۔''

بلاشبہ 'طلاق' ایک نامبارک اور نازیبا عمل ہے مگر کبھی کبھی فریقین کی زندگی کو سازگار بنانے کے لیے اس رسمِ قبیح کو انجام دینا پڑتا ہے۔افسانہ نگار نے اپنے کچھ افسانوں میں یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ''طلاق'' دراصل بیوی کی بدمزاجی یا غلط کاری کے باعث ہی نہیں بلکہ گھر والوں کے بے جا تقاضوں اور نامعقول باتوں کے باعث بھی عمل میں آتی ہے۔مثلاً افسانہ ''سیکنڈ ہینڈ مرد'' کا کردار ثاقب اپنی شادی کے پانچ سال بعد تک بچہ پیدا نہ ہونے کے باعث اپنے والدین کے دباؤ میں آ کر طلاق دے دیتا ہے۔راوی کے مطابق:

''بیوی کی جدائی کا داغ ثاقب نے یقینا اپنے دل پر لیا تھا وہ اسے سی حال میں طلاق نہ دیتا۔اگر خاندان کے لوگوں نے اس کے لیے حالات سازگار نہ کیے ہوتے۔''

''بس بیوی کو طلاق دینے کے بعد اس کی شخصیت ہی بدل گئی تھی اس نے اپنے والدین سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔پوتے کے لالچ میں والدین بیٹے سے بھی دور ہو گئے تھے۔''

''بندھن'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ''پارٹنرشپ'' افسانے کے نسوانی کرداروں (شاہ نواز اور لیاقت علی کی بیویوں) کے برعکس ایک وفا شعار اور جاں نثار بیوی (بیوہ) کا مثالی کردار سامنے

آتا ہے۔ایک نوجوان لڑکی شادی کے چند ماہ بعد ہی بیوہ ہوجاتی ہے۔کچھ دنوں اپنے والدین کے یہاں رہنے کے بعد وہ اپنے سسرال چلی جاتی ہے اور بیوگی کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔تقریباً تین سال بعد اس کے والدین اپنے خاندان کے پڑھے لکھے خوب رو نوجوان سے اس کی شادی کرانا چاہتے ہیں مگر وہ اپنے سابقہ شوہر کی وفاداری (یادوں) میں عمر بھر بیوگی کی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرلیتی ہے۔اہل خانہ اس کی نکاح کی تیاری کرتے ہیں۔وہ دلہن بنی بیٹھی ہے اور اس کا ذہن ماضی کے نقش ونگار میں کھویا ہوا ہے۔

''پہلی ہی ملاقات میں وہ ہیرو بن کر سامنے آیا تھا اور دوسری ملاقات میں منگیتر،ایک ہی کالج میں پڑھتے ہوئے ملاقات روز ہی ہوجایا کرتی تھی،وہ اسے ہیرو کے نام سے پکارنے لگی تھی۔ملاقاتیں دوستی میں بدلتی گئیں اور دوستی اٹوٹ محبت کی شادی میں تبدیل ہوگئی تھی۔مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا اور وہ بیوہ بن کر رہ گئی تھی۔۔۔اور اب پھر سے دلہن بنادی گئی تھی۔''

مگر نکاح کے ایجاب وقبول سے قبل ہی دلہن کی دل خراش آواز گھر کا سارا سکون درہم برہم کرڈالتی ہے۔نئی نویلی دلہن شادی کا آنچل تار تار کر کے پھینک دیتی ہے اور دروازے سے باہر نکل جاتی ہے۔۔۔دولہا اور مولوی صاحب حیرت سے ایک دوسرے کا منھ تکے جاتے ہیں۔شاید ہی کسی دولہا نے دلہن کا یہ روپ دیکھا ہوگا۔رات کے اندھیرے میں دلہن کو ہر سو ڈھونڈا جاتا ہے اور وہ اپنے مرحوم شوہر کی قبر پر فریاد کرتی نظر آتی ہے۔۔۔''میرے ہیرو!میں ایک بار پھر سے گھر کر رہ گئی ہوں ۔۔۔آؤ مجھے بچالو ۔۔۔یا پھر اپنے پاس ہی مجھے بلا لو میں صرف اور صرف تمھاری ہوں ۔۔۔تمھاری!''

ظاہر ہے کہ ایسے مثالی کردار آج کل کم ہی ملتے ہیں تاہم وفا شعار اور جاں نثار خواتین (بیویوں) سے یہ دنیا کبھی خالی نہیں ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

اسی طرح ''خاموشی'' نامی افسانے میں مصنفہ نے ایک روایتی ناخواندہ گھرانے میں جہاں ایک ایک عورت کے چھے چھے (6-6) بچے تھے۔'صائمہ' گھر کی سب سے چھوٹی اور آخری بہو تھی۔ایاز

احمد گھر کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے جنھیں کالج تک پڑھایا گیا تھا۔صائمہ بی بی ایاز احمد کی بیوی تھی ، پڑھی لکھی تھی ، کم گو اور بھولی بھالی تھی اور گھر کی ان پڑھ بیویوں (جٹھانیوں) کی باتوں کا مرکزی کردار بنی رہتی تھی۔شادی کے چار سال تک اولاد نہیں ہونے پر جٹھانیاں صائمہ کو ہدفِ طنز بناتی رہتی ہیں۔کبھی ایاز کی دوسری شادی کرانے تک کی باتیں کرتی ہیں۔مگر صائمہ خاموش رہتی ہے۔چار سال کے بعد صائمہ کے جڑواں بچے (صدف اور شاہ مراد) پیدا ہوتے ہیں۔صائمہ اور ایاز اپنی فیملی کو مکمل سمجھتے ہوئے مزید بچے نہیں چاہتے ہیں۔اس پر بھی گھر والے (جٹھانیاں) ان کو طرح طرح کی باتیں کر کے طنز و تشنیع کا ہدف بنائے رکھتے ہیں تاہم صائمہ ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتی کہ یہ اس کا شعوری عمل ہے۔

''اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ پھٹ پڑے، حقیقت بتلا کر ان بڑی بیویوں کی آنکھیں کھول دے۔انھیں صاف صاف بتلادے کہ اسے تمھاری طرح درجنوں بچے نہیں چاہیے تھے۔مگر حقیقت بتلا دینے میں بھی اس کی عافیت قطعی نہ تھی، بلکہ ایک مصیبت مول لینے والی بات تھی۔۔۔اپنے ساتھ اپنے شوہر کو بھی بے آبرو کروا ڈالتی ،نہ جانے دونوں کی پھر کن کن مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔وہ زبان اپنے دانتوں تلے دبا لیتی ہے۔وہ سب کچھ چپ چاپ سنتی جاتی ہے اور سہ جاتی ہے۔جلی کٹی سننا اور سہہ جانا اس کی فطرت کا خاصا ہے۔چپ رہنے میں جو راحت اور عافیت ہے یہ وہی جانتی ہے۔''

یہ دراصل بہت ہی روایتی خاندانوں اور قدیم معاشرے کا مسئلہ ہے جہاں کثیر العیالی کو گھر اور خاندان کی شان سمجھا جاتا تھا۔آج کے معاشرے میں فیملی پلاننگ عام بات ہے مگر افسانہ نگار نے جس خاندان کا قصہ بیان کیا ہے وہاں ایسی باتوں اور احتیاطوں کو قبیح اور خلافِ فطرت سمجھا جاتا ہے ۔ہمارے خیال سے 'صائمہ' کو خاموش رہنے کے بجائے دوسری بیویوں (جٹھانیوں) کو بھی اس سلسلے میں متنبہ اور محتاط کرنے کی سعی کرنی چاہیے تھی۔

''پانچ سو روپے'' نامی افسانہ بہ ظاہر ایک واقعاتی افسانہ معلوم ہوتا ہے،اس میں مصنفہ نے اپنے معیوب دانت کی پرائیویٹ کلینک پر فلنگ (Filing) کرانے کے واقعہ کو محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے۔دانتوں کی فلنگ کی فیس (پچاس روپے) طے کرنے کے باوجود ڈاکٹر Patient سے پانچ سو روپے وصول کر لیتی ہے۔راوی کے بیان کے مطابق:

''دانتوں کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا: فلنگ ہو جائے گی اور مسالہ وہ بھروں گی جو دانتوں میں میچ

بھی کرے گا۔۔۔''

''ڈاکٹر نے نہایت اچھے ڈھنگ سے مرے دانتوں کی مرمت کی اور جب میں نے آئینے میں اپنے دانت دیکھے تو میں سچ مچ خوش ہوا ٹھی اور ڈاکٹر کو صد تحسین نظروں سے سر سے پاؤں تک دیکھا اور دل ہی دل میں ڈاکٹری کے پیشہ کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔''

مریضہ (یعنی مصنفہ) ڈاکٹر کو طے شدہ فیس دیتی ہے مگر ڈاکٹر اس پہ راضی نہیں۔۔۔وہ ڈیڑھ سو روپے پر بھی راضی نہیں ہوتی۔

''ڈاکٹر نے کہا:''میں نے مسالا اصلی بھرا ہے اور میں نے محنت زیادہ کی ہے اور تمھارا ایک دانت نہیں بلکہ دو دانت درست کیے ہیں، تمھاری شادی نہ ہوئی ہوتی تو پھر تمھیں احساس ہوتا۔''

بہر حال تھوڑی بہت گفت وشنید کے بعد بالآخر Patient کو پانچ سو روپے ادا کرنے پڑتے ہیں ۔پچاس ساٹھ روپے اپنی فیس بتانے کے بعد خاتون ڈاکٹر Patient سے پانچ سو روپے وصول کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے مگر Patient یعنی راوی کی ذہنی کیفیت غیر ہوئی جاتی ہے۔سنیے:

''کلینک سے نکل کر میں نے خود کو ہلکا محسوس کیا۔۔۔مگر کوئی پندرہ بیس گز آگے چل کر پانچ سو روپے جانے کا غم بڑھنے لگا اور دل بوجھل ہونے لگا اور یہ احساس بھی جاگنے لگا کہ اس شہری ڈاکٹر نے مجھ دیہاتی لڑکی کو ٹھگ لیا تھا۔لوٹ لیا تھا۔ہاں میں ڈاکٹر کے ہاتھوں لٹ چکی تھی۔''(پانچ سو روپے)

بلا شبہ ڈاکٹروں کا مزاج علاج کی بجائے پیسے بنانے کا ہوتا جارہا ہے۔جب کہ طبابت (حکمت) ایک مقدس ومبارک پیشہ ہے۔یہ دراصل شفا بخشی کے ساتھ ساتھ حصول ثواب کا مناسب ذریعہ بھی مگر حرص کے زیرِ اثر زیادہ تر ڈاکٹر کمائی کی ہوس میں، بنیا گیری کرنے کے عادی ہو چلے ہیں۔

''فیصلہ'' نامی افسانے میں مصنفہ نے ایک آئیڈیل کردار(Ideal Character) پیش کیا ہے۔ایسے وضع دار اور مثالی افراد آج کے سماج ومعاشرے میں مشکل سے ہی مل پاتے ہیں۔'راشد'ایک سنجیدہ اور کھرے انسان ہیں۔ان کی دو بیویاں ہیں۔دونوں ان سے سچی محبت کرتی ہیں اور راشد بھی دونوں سے دیانت اور انصاف و انسیت کا برتاؤ کرتے ہیں۔مگر دوسری بیگم کی خواہش ہے کہ راشد اپنی پہلی بیوی کو طلاق دیں،لیکن راشد ایسا نہیں چاہتے کہ پہلی بیگم انھیں طلاق کا

کوئی بہانہ یا موقع ہی نہیں دیتی ہے۔ وہ ایک بردبار اور وفادار خاتون ہے۔ راشد اس کی ادائے دلبری پر فریفتہ ہیں۔ تاہم چھوٹی بیگم گلہ مند ہے کہ:

''راشد کا طریقۂ کار اب میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ وہ مجھے بھی خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے اور بڑی بیگم کو بھی اور میرے ساتھ کیے ہوئے وعدے کی جوازیت میں کہتے: ''بڑی بیگم کوئی گستاخی ہی نہیں کر رہی ہے۔۔۔ اسے کچھ کہو تب بھی برا نہیں مانتی ہے۔ تم خود اس سے الجھ پڑتی ہو، وہ تمھیں بھی کچھ نہیں کہتی۔ ہم دونوں کی خدمت میں لگتی رہتی ہے، اب تم بتاؤ میں کیا کروں۔۔۔؟''

وقت گزرتا رہا، راشد کو کوئی بہانہ نہ ملا اور بڑی بی میری آنکھوں میں کھٹکتی رہی۔ جب بھی میں نے اسے بھگانے کی کوشش کی، وہ مجھے ہی بھگانے پہ تل آئی۔ آخر کار تنگ آ کر ایک روز میں نے راشد سے کہا: ''اب تمھیں ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ جو تمھیں زیادہ چاہتی ہے اور زیادہ خدمت کرتی ہے۔ اُسے رہنے دو۔۔۔ دوسری کو طلاق دے ڈالو، چاہے طلاق پانے والی میں ہی کیوں نہ ہوں۔''

''یہ فیصلہ کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ راشد نے کچھ کچھ لاچار ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیوں کہ تم دونوں مجھے ایک جیسا ہی چاہتی ہو۔ واللہ جتنا تم مجھے چاہتی ہو۔۔۔ اتنا ہی بڑی بیگم بھی مجھے چاہتی ہیں۔''

''اچھا تو تم کسے زیادہ چاہتے ہو۔۔۔ مجھے یا بڑی بیگم کو؟'' صحیح جواب دو، میں خود ہی فیصلہ کر لوں گی۔''

''میں تم دونوں کو ایک جیسا ہی چاہتا ہوں۔ تم دونوں میری دو آنکھیں ہو۔ کیوں کہ دو بیویوں کا شوہر ہوں اور دونوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا میرا فرض ہے۔ کیوں کہ بے انصاف شوہر کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی سزا مقرر کر رکھی ہے۔''

راشد کا یہ معصوم سا جواب سن کر میں ایک ساتھ رونے اور ہنسنے لگی اور بے بس ہو کر رہ گئی۔''

افسانہ نگار نے کہانی کا خاتمہ انتہائی فن کارانہ انداز میں کیا ہے۔ چھوٹی بیگم سے بالآخر کہلوایا گیا ہے کہ:

''انصاف کے اس پیکر کو نہ میں چھوڑنے کے لیے تیار تھی اور نہ ہی بڑی بیگم۔ مگر۔۔۔ بڑے ہی عرصہ بعد اس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ ہی چھوڑ دیا اور ایک ہی نام دیا ''بیوہ۔'' (فیصلہ)

مصنفہ نے اس افسانے میں جہاں ایک دیانت دار اور وفا شعار مرد (شوہر) کا کردار

ابھارا ہے، وہیں عورت کی فطری و نفسی گرہیں کھولنے کی سعی بھی کی ہے۔

''مجبوری'' افسانے میں مصنفہ نے کشمیر کے غربت زدہ مفلوک الحال اور قدامت پسند برادری کے گھر کی حالتِ زار کا حقیقی ماجرا بیان کیا ہے۔ ایک دقیانوسی (Orthodox) کثیر الاولاد غریب خاندان، جس کا گزران دوسروں کی امداد و اعانت پر منحصر ہے۔ ایک عورت (چھے بچوں کی ماں) صبح سے شام تک دور و نزدیک کے گھروں سے مدد اور مستعار (رقم) حاصل کر کے اپنے گھر کی کفالت کرتی ہے۔ حتیٰ کہ بیٹے کی شادی بھی امدادی رقم (مستعار لی ہوئی) سے کرتی ہے۔ گھر کے خراب و خستہ حالات کے باوجود وہ شادی بڑی دھوم دھام سے کرتی ہے۔ برادری کی تمام رسوم و روایات بھی نبھاتی ہے۔ اس دوران وہ مقروض ہو جاتی ہے اور اپنی بہو کی Delivery کے اخراجات کا انتظام نہیں کر پاتی ہے۔ چار دنوں تک دردِ زہ میں مبتلا رہتے ہوئے بالآخر وہ انتقال کر جاتی ہے۔ ایک افلاس زدہ گھر کی بڑی بہو کی پہلی Delivery کی الم ناک روداد راوی نے کچھ اس طرح بیان کی ہے:

''گھر کے ایک اندھیرے کونے میں گھر کی بہو درد کے مارے پچھاڑیں کھا رہی ہے۔ اس کے اردگرد عورتوں کی بھیڑ لگی ہے۔ بہو درد کی شدت سے چیخ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ رنگت زرد پڑ چکی ہے، دیکھنے سے خوف آتا ہے۔ اس کو فوراً شہر کے بڑے ہسپتال میں پہنچایا جائے۔ یہ یہاں کسی صورت بھی فارغ نہیں ہو سکتی۔ میں چیخ چیخ کر کہتی ہوں۔ میں پرس سے دو ہزار روپے نکال کر اس کے (عورت کے) حوالے کرتی ہیں۔ بہو کو ہسپتال لے جایا جاتا ہے۔ اس سے بیٹھا بھی نہیں جاتا اور لیٹا بھی نہیں جاتا۔ وہ درد کی شدت سے ہاتھ پاؤں پٹخ رہی ہے۔۔۔ اسے زبردستی چارپائی پر لٹا کر ہاتھ پاؤں چارپائی کے ساتھ باندھ دیے جاتے ہیں اور سڑک تک لے جایا جاتا ہے۔ کچھ دیر بس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔۔۔ پھر بس آتی ہے۔۔۔ روتی بلکتی چیختی چلاتی بہو ہسپتال کی سیڑھیوں تک ہی پہنچ کر خاموش ہو جاتی ہے، بالکل خاموش! ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔'' (مجبوری)

افسانہ ''وہ آئے تو سہی'' میں مصنفہ نے ایک ''بیوہ'' عورت کی داستانِ الم بیان کی ہے یہ دراصل کہانی سے زیادہ ایک حیران و پریشان عورت کے درد و داغ کا نوشتہ ہے۔ مصنفہ نے اس کہانی میں ایک دکھی عورت کو پیش آمدہ ذہنی و جذباتی مسائل کو موثر طریق سے بروئے کار لانے کی سعی کی ہے۔

ایک بیوہ (بچوں والی) عورت اپنے پڑوس میں رہنے والے (شادی شدہ) مرد کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اُس سے نکاح کر لیتی ہے۔ مگر نکاح کے بعد بھی وہ اپنے گھر پر ہی رہتی ہے۔

اُسے اپنے گھر نہیں لے جاتا ہے بلکہ کھانا بھی نئی بیوی کے گھر پر ہی کھاتا ہے اور اس سے طے شدہ مہر معاف کرانے کا اصرار کرتا ہے۔ افسانے کے خاتون کردار کے مطابق:

''میں اس کی بیوی تب تک ہی ہوں جب تک اپنے بچوں کے گھر سے کھاتی ہوں اور اسے بھی کھلاتی ہوں۔ آہ! بچوں کو پالنے کی خاطر شوہر کیا۔ اب الٹا اِسے پال رہی ہوں۔ میری ضرورتیں اِسے دکھائی نہیں دیتی ہیں۔ میری التجائیں اسے قائل نہیں کرسکتی ہیں، تو پھر کیوں نہ میں اس سے طلاق لے لوں لیکن۔۔۔ کیا میں اپنے ماتھے پر یہ دَودَو کلنک سہار پاؤں گی۔ پہلے بیوہ پھر طلاقن''

کہانی کی یہ دکھی عورت گذشتہ چھے برسوں سے اپنے نام نہاد شوہر کی عیاری، سفا کی اور عیش کوشی کا عتاب جھیل رہی ہے۔ خانگی ضروریات ولوازمات سے وہ یکسر بیگانہ رہتا ہے تاہم عورت کے دل میں بس ایک ارمان ہے کہ:

''اب کی بارہ وہ آئے تو میں اُس سے یہ ضرور پوچھوں گی کہ مجھے دینے کے لیے تمھارے پاس کچھ نہیں تھا تو تم نے دوسری شادی آخر کی ہی کس لیے؟ صرف یہ دکھانے کے لیے کہ تم دو بیویوں کے شوہر ہو؟''

ظاہر ہے کہ ہمارے سماج میں اس Mentality کے بہت سے اشخاص (Typical Character) موجود ہیں جو ایک سے زیادہ زیادہ شادیاں کرنے کے شوقین ہیں۔ انھیں شاید یہ خوش فہمی ہے کہ زیادہ شادیاں کرنے سے ان کی سماجی و اقتصادی حیثیت میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشرے میں ان کا مردانہ رعب قائم رہتا ہے۔

''ہم سب ایک ہیں'' انشائیہ نما افسانہ ہے۔ اس میں مصنفہ نے تمثیلی پیرائے میں رشوت (Bribe) کے مختلف طریقوں اور ذریعوں مثلاً تحفہ، نیاز، سوغات، کمیشن کو تمثیلی اور مرئی انداز میں متعارف کراتے ہوئے ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں رشوت رسانی کے مظاہر کی نشان دہی کی ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے انشائی اسلوب میں ہمارے سماج میں موجود اس رسمِ قبیح کی (مختلف صورتوں میں) موجودگی اور اس کی بدولت انجام پانے والے امور کی نشان دہی کی ہے۔ 'رشوت' کی زبانی مصنفہ نے بڑے پتے کی بات کہلائی ہے۔

''حضرت! (پیر صاحب) نیاز آپ کے یہاں پہنچی ہے۔ تحفہ بڑے عہدے داروں کے ہاں جاتا ہے۔ سوغات بڑے لوگوں کے ہاں جاتی ہے۔ کمیشن بڑے بڑے آفیسروں کے ہاں جاتا ہے

اور میری پہنچ میں شریف اور سیدھے سارے لوگ ہی رہ جاتے ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہے، میں ان کے مدد کرتی ہوں ۔ان کے گھر کا چولہا ہانڈی گرم کرتی ہوں ۔میرا اپنا حلقۂ احباب ہے۔میں کسی ایرے غیرے کے ہاں ہرگز نہیں جاتی ہوں اور جہاں آتی جاتی ہوں ایمان داری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی ہوں اور کسی کو دھوکا نہیں دیتی ہوں۔آئندہ میں کسی کی پکڑ میں نہیں آؤں گی بس اس بار مجھے معاف کر دیا جائے۔'' (ہم سب ایک ہیں)

یعنی کے تحفہ،سوغات اور کمیشن کی گرفت (رشوت کے روپ میں) ذرا مشکل ہے۔مگر 'رشوت' اکثر پکڑ میں آجاتی ہے ۔دوسرے یہ کہ اس کی معرفت ناممکن کام بھی ممکن و مکمل ہوجاتے ہیں۔افسانہ نگار نے اس انشائیہ نما افسانے کے ذریعے ہمارے معاشرے میں موجود رشوت خوری اور رشوت رسانی کے مختلف طریقوں کی نشان دہی کی ہے۔

تحفہ ،سوغات ، نیاز اور کمیشن یہ تمام چیزیں درحقیقت 'دولت بانو' کی معنوی اولادیں ہیں۔ جسے عرفِ عام میں ''نقد نرائن'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ زندگی کے تمام شعبہ جات میں اب ''دولت بانو'' (نقد نرائن) کی رسائی ہے اور اس کے ذریعے مشکل اور ناممکن کام بھی ممکن الحصول ہوسکتے ہیں۔'**بے ایمان**' نامی افسانہ میں بھی 'رشوت خوار' کی رسمِ مذموم کو ہدف بنایا ہے۔ایک رشوت خور ملازم سرکاری کاموں (فائل پاس کرنے) کی انجام دہی کے دوران لوگوں (عرضی گزاروں) سے رشوت کے معاملات قائم کرتے ہیں ۔یہ رسمِ قبیح بیشتر سرکاری محکمات میں بآسانی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔لیکن اکیسویں صدی میں اس صیغہ میں یہ ترقی ضرور ہوئی ہے کہ رشوت رساں اگر چاہے تو رشوت خور کو پکڑوا سکتا ہے۔( کیمرے کے ذریعے) 'بے ایمان' افسانے میں عرضی گزار ایک رشوت خور سرکاری ملازم کو کیمرے کے ذریعے گرفتار کرانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

'عبرت' مصنفہ کا سب سے طویل (30 صفحات پر مشتمل) افسانہ ہے۔اس بیانیے (Narration) میں افسانہ نگار نے مولوی باسط علی (مرکزی کردار) اور ان کے افرادِ خاندان (بیوی بچوں) سے متعلق متعدد خانگی واقعات و معاملات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔لہٰذا اس میں واقعہ در واقعہ کا سلسلہ چلتا ہے جس کے باعث 'افسانہ' واقعات کی کھتونی بن کر رہ گیا ہے۔اس کا پلاٹ بے سمت بھی ہے اور بے ربط بھی تاہم پورا افسانہ مولوی باسط علی (سخت مزاج، بنیاد پرست مولوی) کی تلون مزاجی، روایت پرستی اور کم اندیشی ایسی قباحتوں اور شخصی کمزوریوں کے اردگرد گھومتا ہے۔

مولوی باسط علی اپنی بڑی بیٹی صبیحہ کی شادی اپنی برادری کے مولوی اکبر علی کے بیٹے اصغر علی (چھوٹے قد کا) سے طے کرتے ہیں جسے ان کی بیٹی (صبیحہ) ناپسند کر دیتی ہے اور اپنی پسند کے لڑکے (سہیل) سے کورٹ میں جا کر شادی کر لیتی ہے۔ مولوی باسط علی کو گمان گزرتا ہے کہ ان کی بیوی بھی اس سازش (بیٹی کو فرار کرانے) میں شامل ہے چنانچہ وہ اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیتے ہیں۔ کچھ روز بچے باپ کے پاس رہتے ہیں مگر ایک روز موقع پا کر سب اپنی ماں کے پاس (ننھیال) چلے جاتے ہیں۔ مولوی باسط علی اپنی حرکات پر پچھتاتے ہیں اور بالآخر برادری کے معززین کے سمجھانے پر حلالہ (قربان علی سے) کے بعد عقدِ ثانی کر کے بیوی بچوں کو اپنے گھر لے آتے ہیں۔''

افسانہ نگار نے اس بیانیے میں بیک وقت کئی سماجی، مذہبی اور نفسیاتی معاملات و مسائل اٹھائے ہیں، حسبِ موقع اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ ایک طرف راوی نے جہاں مولوی باسط علی جیسے نام نہاد مولوی کے کردار کی بہت سی کمزوریوں (سخت مزاجی، کٹر پن، تشدد پسندی) کو نشان زد کیا ہے وہیں صبیحہ اور اس کی ماں کے کرداروں کے ذریعے نسوانی احساس و نفسیات کے بھی کئی پہلو ابھارے گئے ہیں۔ مثلاً:

''ہاں میری صبیحہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ جب لڑکا ہی اسے پسند نہیں تو وہ کیوں کر نبھائے گی۔ شادی میں شکل وصورت اور پسندیدگی ایک خاص معنی رکھتی ہے۔ قد کاٹھ اور شکل وصورت پسند نہیں ہو تو میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے بوجھ بن جاتے ہیں۔ نت نئے مسائل اور جھگڑے جنم لیتے ہیں۔ شوق اور جذبے نفرت اور حقارت کی دبیز تہوں میں دبتے چلے جاتے ہیں۔ اُف بہت کٹھن ہوتا ہے ایک ناپسندیدہ وجود کے ساتھ نباہ کرنا۔''

''صبیحہ اب اس دلیر لڑکی کے دل و دماغ میں سے سوچ رہی تھی۔ اس کی زبان میں باتیں کر رہی تھی۔ ہونہہ دیکھتی ہوں کیسے ہوتی ہے یہ اَن چاہی شادی؟ یہاں زبردستی کی شادیاں ہوتی ہیں۔ پھر لڑائیاں ہوتی ہیں، پھر طلاقیں ہوتی ہیں اور ابّا جی (باسط علی) حلالہ کروا کر لوگوں کو عبرت دیتے ہیں۔ میں بھی ایک عبرت دوں گی کہ اب کے بعد کوئی بھی اپنی بیٹی کی زبردستی شادی نہیں کرے گا۔ بھلا ایک ناپسندیدہ شخص کے ساتھ عمر بھر رہنا کہاں کا انصاف ہے۔''

قربان علی سے حلالہ کی رسم ادائیگی کے دوران مولوی باسط علی کی بیوی کی ذہنی کیفیت افسانہ نگار نے کچھ یوں بیان کی ہے:

''مولوی جی کی بیوی کے لیے وہ رات، اُس رات سے بھی کہیں زیادہ کٹھن، طویل اور تاریک ہوگئی تھی، جس رات صبیحہ گھر سے فرار ہوئی تھی اور جس رات مولوی جی نے اُسے طلاق۔۔۔طلاق کہہ کر گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ رات بھر وہ دعا مانگتی رہی۔ یارب! کسی بھی عورت کی زندگی میں یہ رات کبھی نہ آئے۔''

اس طرح مصنفہ نے اس بیانیے میں مسلم معاشرے کے کئی مسائل اٹھائے ہیں۔ مولوی باسط علی کی دقیانوسی شخصیت، ان کی سخت مزاجی، روایت پسندی، تنگ نظری کے ساتھ ساتھ بیوی کے ساتھ ظلم وتشدد، بیٹی (صبیحہ) کی بے میل (ناپسند) شادی اور پھر اپنی طلاق شدہ بیوی کو 'حلالہ' کرا کے منکوحہ بنانے جیسے مسائل و معاملات افسانہ نگار نے اس افسانے میں جمع کر دیے ہیں۔ میرے خیال سے اس ایک افسانے میں بیک وقت دو، تین افسانوں کے پلاٹ تعمیر ہو سکتے تھے۔۔۔اس لیے 'عبرت' کے پلاٹ میں کساوٹ کے بجائے بکھراؤ نظر آتا ہے۔ یہ افسانہ (Short Story) سے زیادہ بیانیہ (Narration) بن کر رہ گیا ہے۔ کرداروں کی بہتات بھی اکھرتی ہے۔

''اگلی کارروائی'' افسانہ دیہی فضا میں لکھا گیا ہے جہاں تمام قانونی فیصلے اور سزا و جزا کے معاملات گاؤں کی 'پنچایت' کے ماتحت انجام پاتے ہیں۔ زمین داروں اور جاگیرداروں کا وہاں سکہ چلتا ہے اور ہر طرح کے ظلم و جبر کا تصفیہ پنچوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ آج بھی ہمارے ملک کے کئی صوبوں اور علاقوں میں اس قسم کا ''پنچایتی راج'' سرکاری و نیم سرکاری سطحوں پر جاری و ساری ہے۔

زیرِ مطالعہ افسانہ (اگلی کارروائی) میں ظالم و مظلوم کے دو کرداروں کے مابین انجام پذیر ظلم و جبر اور انتقامی کارروائی پر مشتمل واقعات کو افسانہ کے پیکر میں ڈھالا گیا ہے۔ نورا (امیر زادہ) کا لڑکا (ظالم) ایک یتیم لڑکی (میٹرک پاس) کے ساتھ 'زیادتی' کر کے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مظلومہ اپنی بیوہ ماں کے ساتھ تھانے (Police Station) رپٹ درج کرانے پہنچتی ہے جہاں اسے ثبوت و گواہ کا پاٹھ پڑھایا جاتا ہے کہ:

''ثبوت کے لیے تمھیں ڈاکٹری جانچ سے گزرنا ہوگا اور ڈاکٹری سرٹیفکیٹ ساتھ لانا ہوگا۔ تب ہی

کارروائی ممکن ہوگی۔ بہ مشکل تمام ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لے کر ماں بیٹی نورا کے لڑکے (بدمعاش) کے خلاف پولیس اسٹیشن جاتی ہیں مگر گاؤں کے سرپنچ اور چند معتبر لوگ انھیں کارروائی کرانے سے باز رکھتے ہیں اور اسی ظالم سے شادی کرانے کا دباؤ بناتے ہیں تاکہ گاؤں کا مسئلہ گاؤں میں ہی حل ہوجائے (اور امیر زادے کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو) مگر مظلومہ اپنے ساتھ ہوئی زیادتی کا انتقام لینا چاہتی تھی اور بدلہ بھی: ''بس یہی تھا کہ ملزم کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے، اسے سنگ سار کیا جائے۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا مگر فیصلہ تو قانون کو کرنا تھا، بالآخر کچھ سوچ کر وہ (لڑکی) شادی کے لیے تیار ہوگئی اور بظاہر گاؤں کا مسئلہ گاؤں میں ہی حل ہوگیا۔'' صلح نامہ اور نکاح نامے کے کاغذات تھانے میں پہنچا دیے گئے۔ جس کو وہ سزا دلوانا چاہتی تھی اب وہ خود ہی اس کے گلے کا ہار بن گئی تھی۔''

(اگلی کارروائی)

نورا کے لڑکے (ظالم) کی دلہن بن کر اس کے گھر پہنچنے کے بعد کی روئیداد افسانہ نگار نے کچھ اس طرح بیان کی ہے:

''رات کے آخری پہر نورے کے گھر والے دل خراش چیخیں سن کر کمرے کی طرف لپکے جہاں رات کو دلہا دلہن کو سلایا گیا تھا۔۔۔ اندر کا منظر دل دہلا دینے والا تھا۔ دلہا سر سے پاؤں تک خون میں لت پت پڑا تھا، اس کی ناک کٹی ہوئی تھی اور زیرِ ناف بھی اور دلہن غائب تھی۔ وہ پچھلی کھڑکی کے راستے بھاگ نکلی تھی۔ اپنی اماں کو خبر سنانے۔۔۔ اب وہ دہاڑیں مار کر رو نہیں رہی تھی، نورے کے بیٹے کی زیادتی کی شکایت نہیں کر رہی تھی بلکہ ایک اعتماد کے ساتھ کہہ رہی تھی:
''اماں! میں نے اپنی تذلیل اور اذیت کا بدلہ لے لیا ہے!!'' (اگلی کارروائی)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے ظالمانہ اور وحشیانہ واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں مگر اکثر لڑکیاں ظالم سے انتقام لینے کی ہمت نہیں کر پاتی ہیں۔ افسانہ نگار نے اس قسم کے وحشیانہ جرم کا بدلہ لینے کی جو تدبیر بیان کی ہے وے یقیناً حوصلہ افزا بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ جب تک ظالم کو اس کے ظلم کی سزا نہیں ملتی، ظلم کا یہ سلسلہ تھمنے والا نہیں ہے۔ افسانہ نگار نے اس کا عنوان ''اگلی کارروائی'' تجویز کیا ہے۔ ہمارے خیال سے افسانے کے موضوع و مسئلہ کے لحاظ سے اس کا عنوان 'بدلہ' یا 'انتقام' زیادہ مناسب تھا۔

''کانچ کی سلاخ''ایک اہم افسانہ ہے جس کے نام پر ظاہر پرزنفر کھوکھر نے اپنے دوسرے افسانوی مجموعے کا نام بھی'' کانچ کی سلاخ''(2003) تجویز کیا ہے۔اس افسانے میں مصنفہ نے اگر چہ کشمیر کے دہشت گردانہ ماحول ومسئلہ کے بجائے ایک ایمان دار اور وطن پرست فوجی افسر کا کردار ابھارا ہے،تاہم ضمنی طور پر اس وفادار فوجی افسر (نواز علی) کے ایک بیٹے کے ملی ٹینٹ (Militant) بن جانے کے باعث ازخود دہشت گردی کا مسئلہ افسانے کے Discourse میں شامل ہوجاتا ہے اور اس طرح ''کانچ کی سلاخ''افسانہ کشمیر کے ابتر سیاسی وسماجی حالات کا مظہر بن جاتا ہے۔

نواز علی ایک عام سپاہی سے ترقی کر کے فوج میں بڑے افسر بن گئے تھے۔وہ ملک کے وفادار اور ایمان دار فوجی تھے،انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران پڑوسی ملک کے ساتھ ہونے والی دو جنگوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے تھے۔نواز علی تین بیٹوں کے باپ تھے۔وہ اپنی اولاد کو بھی ملک کی خدمت انجام دینے کی غرض سے فوجی بنانا چاہتے تھے مگر گھر کے ناسازگار ماحول (کشیدگی) کے باعث کوئی بھی اولاد میٹرک بھی پاس نہیں کر پائی۔جو کہ ایک فوجی بننے کے لیے (اس وقت) لازمی اہلیت تھی۔ان کے تینوں بیٹے ماں کے بے جا لاڈ پیار کے باعث کاہلی اور آوارگی کے شکار ہو گئے تھے۔بقول راوی:

''گھر سے اکثر باہر اور آوارہ لڑکوں کی صحبت میں رہ کر نواز علی کے بیٹے اب سگریٹ بیڑی کا نشہ بھی کرنے لگے تھے۔چھوٹے لڑکے کو جب انھوں نے سگریٹ پیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا تو جم کر اس کی پٹائی کی۔جس کے بعد کچھ عرصہ تک دور پار کے رشتہ داروں سے اس کا پتہ ملتا رہا اور پھر وہ لاپتہ ہوگیا۔''

نواز علی کا یہی چھوٹا (تیسرا) بیٹا گھر سے باہر رہتے ہوئے غلط لوگوں کی صحبت میں پڑ کر بالآخر دہشت گردوں میں شامل ہوجاتا ہے اور اس طرح ایک محب وطن فوجی افسر کی اولاد ملک دشمن تنظیم کا حصہ بن جاتی ہے راوی کے مطابق:

''نواز علی اب حد سے زیادہ دکھی رہنے لگے تھے۔ان کی صحت بھی کافی گر چکی تھی۔اکثر سوچوں میں غرق دکھائی دیا کرتے تھے.....اور اچانک ایک دن ان کی ذات میں اس وقت شدید زلزلہ برپا ہوا جب ملک کے ایک شورش زدہ حصے سے بڑی تعداد میں ملی ٹینٹ اسلحہ سمیت گرفتار ہوئے اور ان

میں ایک کی شناخت ریٹائرڈ فوجی کے بیٹے کی حیثیت سے ہوئی۔''

ایک وطن پرست فوجی افسر (باپ) کو اپنے بیٹے کی بدنہادی، کجروی اور غداری پر جس قدر ندامت اور افسوس واندوہ ہوسکتا ہے اس کا اظہار مصنفہ نے کچھ اس طرح کیا ہے:

''نوازعلی کے لیے اب سوچنے سمجھنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ان کا سر جھک گیا تھا، وہ سر جو محاذِ جنگ پر دشمن کے سامنے کبھی نہیں جھکا تھا۔جو دو بڑی جنگوں میں بڑی بڑی ذہنی اور جسمانی تکلیفیں اور صعوبتیں اٹھانے پر بھی بلند رہا تھا۔وہ سر جو گھر میں اپنی انا پرست بیوی کے سامنے کبھی نہیں جھکا تھا۔نوازعلی اپنی ذات کے اندر ریزہ ریزہ ہوکر ڈھیر ہوگئے تھے۔آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔شاید یہ ندامت کے آنسو تھے.....شاید افسوس اور پچھتاوے کے تھے۔۔۔نہیں! شاید باپ کی شفقت کے تھے۔'' (کانچ کی سلاخ)

''کب تلک؟'' افسانہ بھی کشمیر کے Terrorism کے وحشت ناک وسفاک ماحول میں لکھا گیا ہے۔دہشت گردوں نے آزادی کے نام پر وادی کے معصوم نوجوانوں کو گمراہ کرتے ہوئے ان کا غلط استعمال کیا اور جو لوگ ان نام نہاد جہادیوں کے چنگل میں نہ آسکے انھیں 'غدار' قرار دیتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔دوسری طرف دہشت گردوں کی تلاشی کے دوران آرمی والوں کی زیادتی کے ہزاروں بے گناہ لوگ شکار ہوئے۔اس المناک فضا میں مصنفہ 'بانو بیگم' کے دو بیٹوں (رحمان وسلمان) کے ساتھ جہادیوں (انتہا پسندوں) اور فوجیوں کے سفاکانہ برتاؤ کی روداد بیان کی ہے۔افسانہ میں وادیِ کشمیر میں آزادی وجہاد کے نام پر جاری سیاسی ومادیت پرستی کی جنگ زرگری کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔راوی کے بقول:

''اب بانو بیگم کو یوں لگنے لگا تھا کہ یہ کرفیو لگانے والے انسان نہیں کوئی اور ہی مخلوق ہیں۔وہ جانماز پر بیٹھی ہوئی رحمان کی مغفرت کی دعا کر رہی تھیں اور سلمان کی واپسی کی بھی ''اے اللہ تو خوب جانتا ہے کہ میرا رحمان غدار اور مردود نہیں تھا۔میرا سلمان آتنک وادی نہیں تھا۔اے مجاہدو! یہ کیسا جہاد ہے تمھارا۔۔۔نقدی اور زیورات تم پستول کی نوک پر رکھوا لیتے لیکن رحمان تمھارے ساتھ نہیں جاسکتا تھا اوروں کو لوٹنے کے لیے وہ اپنی دھرتی پر اپنے ہی لوگوں کا خون نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔وہ تمھارا ساتھ نہیں دے سکا اور تم نے اسے غدار اور مردود کہہ کر اس کا خون اسی کے گھر میں بہادیا۔ایک ماں سے

بیٹا چھین کر، ایک سہاگن کو بیوہ بنا کر دو معصوم بچوں کو یتیم بنا کر تم نے بے گناہ رحمان کو غدار اور مردود کہہ کر مار دیا۔ تمھارا یہ جہاد تمھیں مبارک ہو۔''

بانو بیگم کے دوسرے بیٹے سلمان کے ساتھ (تلاشی کے دوران) یہ ظلم ہوا کہ:

''حفاظتی دستوں نے بے گناہ اور معصوم سلمان کو مار مار کر اپنا غصہ اتارا۔ ان کی چوکی پر بم پھینکا گیا تھا اور پھر قرب و جوار کے رہنے والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ سلمان بھی اسی قیامت کا شکار ہوا تھا۔ آتنک وادی کہہ ظالموں نے اسے دبوچ لیا تھا اور سیڑھیوں سے گھسیٹ کر لے گئے تھے۔''

رحمان کو دہشت گردوں نے شہید کر دیا اور (14 سال کے) سلمان کو آرمی والے زدوکوب کرتے ہوئے اٹھا لے گئے۔ تاہم بوڑھی ماں کو یقین ہے کہ اس کا بیٹا لوٹ کر آئے گا۔۔۔ مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا۔

جانے والے کبھی نہیں آتے جانے والوں کی یاد آتی ہے

وادیِ کشمیر کی ایک کرفیوزدہ آبادی (جہاں کے زیادہ تر لوگ حالات سے پریشان ہو کر محفوظ مقامات پر ہجرت کر گئے) میں بانو بیگم اپنی بیوہ بہو اور پوتوں کے ساتھ انتہائی سخت و نامساعد حالات میں زندگی کے دن کاٹ رہی ہے۔ رحمان کی بیوی (بیوہ) اپنے بچوں کا پیٹ تو نہیں بھر سکتی مگر انھیں اس طرح کی نصیحت ضرور کرتی ہے:

''تم بڑے نہیں ہونا، تم چھوٹے ہی رہنا۔ میں تمھیں اپنا خون پلاؤں گی۔ زندہ رہنے کے لیے سب کچھ ہی تو کرنا پڑتا ہے۔ رحمان بڑا تھا، سلمان بڑا تھا، مگر آج کہاں ہیں وہ! اس طوفان میں بڑوں کا انجام برا ہے۔ تم بچے ہی رہو تا کہ ظالموں سے بچے رہو! مگر کب تلک!؟''

یہ الم ناک کہانی ایک بانو بیگم کے گھر کی ہی نہیں، وادی کے ہزاروں گھروں میں اس طرح کی اَن سنی اور اَن کہی اور بھی کہانیاں ہیں جنھیں سننے اور سمجھنے کی اہلِ اقتدار کو کبھی توفیق نہیں ہوئی، البتہ وہاں کے ناول نگاروں اور کہانی کاروں نے ایسے آتشیں حالات و مسائل پر یادگار تخلیقات پیش کی ہیں۔ جن کے حوالے سے کشمیر میں دہشت گردانہ ماحول و مظاہر کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ زنفر کھوکھر نے اپنے متعدد افسانوں میں وادیِ کشمیر کی مرموز و مجہول سیاست کی پیدا کردہ سماجی و معاشی زبوں حالی کی الم ناک اور دردناک روداد بیان کی ہے۔

زنفر کھوکھر نے اپنے افسانوں میں وادیِ کشمیر کے چلتے پھتے سادہ مزاج (Flat) کرداروں کے ساتھ ہی پیچیدہ (Typical Character) اور مثالی کرداروں (Ideal Character) کے حوالے سے وہاں کی انفرادی واجتماعی زندگی کے حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے اپنے کرداروں (مرد/نسوانی) کی نفسیات سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس نوعیت کے افسانوں کا مطالعہ انتہائی دل چسپ ہے۔ مثلاً 'عبرت' افسانے کا مولوی باسط 'کمائی' کے بڑے میاں (حسن محمد) 'بلا عنوان' کی اسّی سالہ بزرگ خاتون 'بے بے'، 'انتقامی' کا 'سعید'، 'دھما کا' کا معروف احمد، 'وہ آئے تو سہی' کا مرد کردار (دو بیویوں کا شوہر) 'مجبوری' کی کثیر الاولاد غریب خاتون جو اپنے گھر کے تمام اخراجات دوسروں سے مانگ کر پوری کرتی ہے۔ وہیں 'خواب' کی 'زاہدہ'، 'کانچ کی سلاخ' کے نواز علی (فوجی افسر) 'خاموشی' کی 'صائمہ'، 'سمجھوتا' کی 'سعدیہ'، 'فیصلہ' کے 'راشد'، 'کب تک' کی 'بانو بیگم'، 'بھول بھلیاں' کا راوی (مصنفہ) 'کچھ نہیں' کی 'نازیہ' ایسے مثالی کردار ہیں جو اپنے خصائل وشمائل، اخلاص و ایثار، صلۂ رحمی، صبر وتحمل، وطن پرستی اور رواداری ایسی خصوصیات کے باعث قومی وسماجی سطح پر اپنی مثال شخصیت کے ساتھ افسانوں میں اپنی امتیازی وانفرادی حیثیت کے ساتھ موجود ومتحرک رہتے ہیں۔ ان کرداروں میں قاری کو متاثر کرنے کی صفت موجود ہے۔ سماج ومعاشرے میں ایسے مثالی کردار اگرچہ خال خال ہی ملتے ہیں تاہم اچھے لوگوں سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی ہے۔ ہر دَور میں انسانیت پسند خوش خلق، ہمدرد اور مفاہمت پسند لوگوں کی عمل پیرائی سے انسانیت کا بھرم قائم ہے۔

زنفر کھوکھر کے افسانوں کے موضوعات اور ان کے کردار رومانی وتخیلی نہیں بلکہ زندگی کے تلخ مسائل سے جوجھتے اور ان سے مقاومت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ سیاست وقت کے جبر اور عتاب کے شکار ہیں تاہم بادِ مخالف میں چراغاں کرنے کے لیے کوشاں بھی ہیں۔ ان کی وطن پرستی، مشقت شعاری، خوش اخلاقی اور رجائیت پسندی، آج کے صارفیت زدہ معاشرے میں تہذیب و تادیب اور تعمیر کردار کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کے افسانوں کا دائرہ کار بہت وسیع نہ سہی تاہم انھوں نے اپنے افسانوں میں وادیِ کشمیر کے جن تلخ حقائق ومسائل کی فن کارانہ ترجمانی کی ہے وہ لائقِ مطالعہ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ زنفر کھوکھر کا افسانوی سفر ابھی جاری ہے۔ افسانے کے ساتھ ہی وہ انشائیے بھی لکھتی ہیں، میرے خیال میں زنفر کو افسانہ کے فنی نکات وخصوصیات پر بھی توجہ دینا چاہیے۔ ان کے بعض افسانے مثلاً 'عبرت' (30 صفحات) 'وہ کون تھا؟' (30 صفحات) 'دہشت کا سماں' (17 صفحات) طویل ہیں۔ دراصل بیانیہ (Narration) میں لکھنے کے باعث زنفر کے

بعض افسانوں میں یہ عیب در آیا ہے۔ دراصل ایسی طول بیانی 'ناول نگاری' میں تو روا رکھی جاسکتی ہے مگر 'افسانہ' کے فن کے منافی ہے۔ غزل کی طرح افسانے کا حسن بھی اطناب کے بجائے ایجاز و اختصار میں مضمر ہے۔ زنفر کھوکھر کو اس طرف بھی توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں ایک افسانے میں بہت سارے کردار اور واقعات مرتب کرنے سے بھی افسانہ کا فن مجروح ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں ناولٹ (Novelette) اور ناول (Novel) میں ہی کھپ سکتی ہیں۔ افسانہ ان کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

Zanfar Khokhar ka Afsanvi Shinakht Nama by Dr. Jawed Anwar

ڈاکٹر جاوید انور (وارانسی) cell-9935957330

# زنفر کھوکھر کا افسانوی شناخت نامہ

زنفر کھوکھر کے افسانوں پر گفتگو کی جائے تو پروفیسر حامدی کاشمیری کے یہ الفاظ ذہن میں آتے ہیں۔

" ملک کے اس دور کے سماجی اور سیاسی پس منظر کے ضمنی ذکر سے یہ جتانا مقصود ہے کہ لوگ خواب و خیال کی دنیا سے نکل کر خارجی حقیقت کا سامنا کر رہے تھے۔ نتیجتاً وہ رومانی تعیش پسندی اور تخیلی گلکاریوں کے افسانوں کے بجائے ایسے حقیقت پسندانہ افسانوں میں دلچسپی لینے لگے جو ٹھوس سماجی مسائل پر مبنی ہوں۔ مزید اس دور میں عوام کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ طبقہ بھی سیاسی اور معاشرتی انقلاب کی آرزومندی کے نشے میں سرشار تھا۔ اور ادب بشمول افسانہ اس کی آرزو کی تکمیل کا وسیلہ بن گیا تھا۔

یہ پس منظر افسانے کے موضوعی کردار کو بھی مستحکم کرتا رہا اور اس کی فنی اور ہیتی تشکیل میں جو تمامتر تسیلی انداز رکھتی ہے، ایک موثر عنصر کے طور پر کام کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور میں افسانے کو بے کم و کاست سماجی اور سیاسی مسائل و واقعات کے لئے ہی مخصوص کیا گیا۔ یوں ابتدائی دور سے ہی اس کے مقصدی منہاج کا تعین ہوا، یعنی مصنف نے اسے اپنے نظریے یا طے کردہ موضوع کو شعوری طور پر پیش کرنے کا وسیلہ بنایا۔" (اردو، افسانہ۔۔ امکانات کی تلاش، مشمولہ اردو افسانہ اور تجزیہ، از۔ پروفیسر حامدی کاشمیری، ص 11)

ویسے تو مندرجہ بالا خیالات کا اظہار پروفیسر حامدی کاشمیری نے پریم چند اور ان کے بعد کے زمانے کی افسانوی فضا کے متعلق کیا ہے لیکن دنیا کے لوگ جس خارجی حقیقت کا سامنا آج کر رہے ہیں، ان کی عکاسی جو زنفر کھوکھر کے افسانوں میں ملتی ہے، وہ پروفیسر حامدی کاشمیری کے اس نظریہ سے زنفر کھوکھر کے افسانوی فن کو منسلک کر دیتی ہے۔

سماجی حقائق کی عکاسی کے لئے زنفر کھوکھر نے اپنے افسانوی فن میں موضوعات کے اعتبار

سے جو تکنیک اپنائی ہے، اس میں تجسس آمیزی کے عناصر اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ افسانے میں در آتے ہیں۔ یعنی بعض یا اکثر افسانوں کی ابتداء ایک تجسس آمیز فضا کے ساتھ ہوتی ہے جو قارئین کے ذہن کو اس سوال کے ساتھ باندھے رکھتی ہے کہ جو مکالمہ کرداروں کے درمیان ہو رہا ہے، وہ کس موضوع کے بارے میں ہے؟۔ جب یہ واضح ہوتا ہے تو ایک تلخ نتیجہ یا کوئی سبق آموز جملہ جو ذہن کو دور تک اور دیر تک سوچنے پر مجبور کر دے، برآمد ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ادبی مسائل جن کی جانب موضوعاتی سطح پر تخلیق کاروں کی نظریں کم کم گئی ہیں، زنفر کھوکھر نے اس سمت کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اپنی تحریروں میں ان کو اس طور برتا ہے کہ ان حالات کی بنیاد کب؟ کیوں؟ اور کیسے؟ جیسے سوالات کے ساتھ اس پوری فضا کا انکشاف کر دیتی ہے۔ ان کا ایک افسانہ" حرف آشنا" ہے جس میں نو واردان کی توقع، تعریف پسندی میں یہ خیال نہ رکھنا کہ جو تعریف کر رہا ہے، اس کا ادبی معیار کیا ہے؟ اور آجکل کی ادبی فضا کیا ہے؟ وغیرہ کی بہت خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ مرکزی خاکہ ایک جوابی خط ہے جو ایک نو وارد یا نو جوان شاعر ایک مستند تخلیق کار کو لکھتا ہے۔ ابتدائی دو پیراگراف درج ہیں۔

" آقا! میرے مجموعہء کلام کے لئے تقریظ لکھنے سے انکار پر مبنی اور دیگر مشوروں، دلائل اور جانکاری سے بھرپور آپ کا جوابی خط بذریعہ سادہ ڈاک ملا۔ پہلے میں تو یہ سمجھا کہ میرے کسی پرستار نے میرے تازہ تازہ شائع ہونے والے مجموعہء کلام پر پیشگی تعریف و توصیف کے انبار لگائے ہوں گے۔ پھر لفافے کی پشت پر آپ کا نام اور اتہ پتہ پڑھ کر خوش ہوا کہ آپ نے میرے تازہ مجموعہ کلام کے لئے تقریظ لکھ بھیجی ہوگی مگر خط کھول کر جب پڑھا تو معلوم ہوا کہ آپ کا تو ہے انداز بیاں کچھ اور۔۔۔!

سب سے پہلے میری طرف سے بہ یک وقت افسوس اور مبارک باد قبول فرمائیے۔ افسوس اس بات کا کہ قدرت نے آپ کو بہت کچھ دیا مگر کشادگیء دل اور وسیع النظری سے محروم ہی رکھا۔ ورنہ ایک معلم اور شاعر ہو کر تقریظ لکھنے سے انکار کر کے آپ ایک شاعر کے دل کو ٹھیس پہنچانے کی بھول ہرگز نہیں کرتے اور مبارک باد اس بات کی کہ قدرت نے آپ کو بے باک اور نڈر زبان بخشی ہے اور ساتھ ہی ساتھ کھری کھوٹی منہ پر کہنے کی جراءت رندانہ بھی عطا کی ہے۔ نیز وسیع معلومات سے مالا مال کیا ہے۔ آپ نے شاعری اور شعراء سے متعلق اظہار خیال کر کے نہ صرف اپنے معلم ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے بلکہ میری معلومات میں بھی اضافہ کیا ہے۔ میں آپ کے خیالات کو صدق دلی سے قبول کرتا ہوں اور یہ جانکاری بہم پہنچانے کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

(حرف آشنا، مشمولہ عبرت، از۔ زنفر کھوکھر، ص114)

اس کے بعد خط کے آگے کا جو حصہ ہے، جو افسانے کو آگے بڑھاتا ہے، وہ آجکل کی پوری عام ادبی فضا کی عکاسی کرتا ہے جو نئے ادبی معاشرے کے ایک عام چلن کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ زنفر کھوکھر نے اپنے افسانوں کے موضوعات میں لمحہ ءفکریہ المیوں پر زیادہ زور دیا ہے ۔موضوع کو ایک لمحاتی حصار میں لینے اور ایک نقطے میں انہیں پھیلانے کا ہنر اس افسانے میں بخوبی نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں ترسیل کا فن کچھ اس طرح نمایاں ہے کہ وہ قاری کے ماحول و مزاج کو بھی اس طور متاثر کرتا ہے جس طور فن کار چاہتا ہے۔ اس کی کامیاب کوششوں کے پس پشت جو تخلیق کا اظہاری رویہ کام کرتا ہے وہ ان کا تجسس ہے۔ یہ تجسس آمیزی افسانوں کے بہت دور تک چلے جانے کے بعد بھی اس کا تعین نہیں کرتی کہ متن کا اصل مدعا کیا ہے۔ یعنی بات سے بات نکل رہی ہے یا ایک ہی مرکزی خیال کو مکالمہ نگاری کے ذریعے مختلف کرداروں کے توسط سے پھیلایا جا رہا اس کا انجام آخر کار کیا ہے۔ آخری سطور میں کلائمکس سے ہوتے ہوئے جب افسانہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے تو وہ یا تو ہمیں کچھ نصیحت کر جاتا ہے یا کسی بڑے مسئلے کی جانب ہمارے ذہن کو منعطف کر جاتا ہے۔

زنفر کھوکھر کے یہاں موضوعات کے اعتبار سے خارجی زندگی یعنی سامنے دکھنے والی زندگی کو پیش نظر رکھا گیا ہے جس میں کردار کی داخلی زندگی کے عناصر بہت کم ہیں اور خارجی زیادہ۔ یعنی ان کے یہاں کردار نگاری کے ذریعہ اجتماعی مسائل کو یا کسی ایسے سماجی نقطے کو پیش کیا جاتا ہے، جس کا تعلق ہم سب کی زندگی کے ساتھ کسی نہ کسی طور ضرور رہتا ہے۔ اس طرح بیانیہ کی کامیابی کا بھی سراغ مل جاتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شولز اور کلاگ کی کتاب میں درج بیانیہ کے حوالے سے بہت عمدہ بات کہی ہے جس کا ذکر یہاں لازمی معلوم ہوتا ہے۔

" کردار نگاری کا سب سے اہم عنصر وہی ہے جسے کردار کی داخلی زندگی کہتے ہیں۔ یہ عنصر جتنا کم ہوگا، فن پارے کی تعمیر میں دوسرے بیانیہ عناصر مثلاً پلاٹ، حالات کا بیان، دوسرے واقعات کے حوالے ،اور بدیعات Rhetoric کا حصہ زیادہ ہوگا۔ کامیاب بیانیہ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اس میں داخلی زندگی پر زور دیا جائے اور اسے تفصیل سے پیش کیا جائے۔ لیکن اسے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے دوسرے عناصر کا استعمال کرنا ہوتا ہے، اگر اسے خود کو انسانی دلچسپی کی چیز کی حیثیت سے باقی رکھنا منظور ہو۔" (افسانے میں بیانیہ اور کردار کی کشمکش از۔ شمس الرحمٰن فاروقی، بحوالہ نیا اردو افسانہ (انتخاب تجزیے اور مباحث) مرتبہ: گوپی چند نارنگ، ص28، 29)

مندرجہ بالا بیان کے تناظر میں اگر زنفر کھوکھر کے افسانوں کو دیکھا جائے تو یہ تمام خصائص ان میں موجود ہیں۔ان کے یہاں جس تجسس آمیزی کا ذکر میں نے کیا ہے اس کی دلیل کے طور پر افسانہ" آخری فیصلہ" کی یہ ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں:

" رہ رہ کر آخری میٹنگ ہوئی۔ادارے کے تیس پینتیس لوگ اپنی اپنی نشستوں پہ براجمان ہو چکے تھے۔ادارے کے افسر اعلیٰ بھی اپنی مخصوص کرسی پر براجمان تھے مگر ان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح تر و تازہ اور ہشاش بشاش نہیں تھا۔ایک پژمردگی تھی جو سارے ادارے پر چھائی تھی۔

ادارے میں ایک ایسا ہتک آمیز واقعہ رونما ہوا تھا کہ جس کی جتنی مذمت کی جائے کم تھی۔میٹنگ ہال کے ایک کونے میں وہ گستاخ شخص بھی موجود تھا جس کو لے کر میٹنگ بلائی گئی تھی۔ اسے اپنے کئے پر نہ تو کوئی پچھتاوا تھا اور نہ ہی وہ نادم دکھائی دے رہا تھا۔وہ بس خاموش کھڑا تھا۔

افسر اعلیٰ نے اپنے ادارے کے ایک ایک فرد کو سنا۔یوں تو وہ گذشتہ دو تین دن سے بھی انہیں سن رہے تھے۔ہر شخص کی ہمدردی اور تعاون افسر اعلیٰ کے ساتھ تھا۔ہر شخص مجرم کے خلاف تھا اور اسے کڑی سے کڑی سزا دلوانا چاہتا تھا۔

اگر چہ افسر اعلیٰ بات کو بڑھانا نہیں چاہتے تھے مگر ادارے کے سبھی ملازمین نے انہیں کہہ دیا تھا کہ جب تک مجرم کے خلاف کاروائی نہ کی جائے ،وہ چین نہیں پائیں گے۔کیوں کہ آج جوان کے ساتھ ہوا، وہ کل کسی اور کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔" ( آخری فیصلہ )

زنفر کھوکھر کے بعض افسانوں میں وہ علامتی پیرایہ اظہار بھی ملتا ہے جو موضوع اور مواد کے اعتبار سے کسی ایک خاص مقام مثلاً کسی محلے، گاؤں، شہر ملک کی حدود سے باہر ہے۔یعنی ان کا اطلاق بہ یک وقت کئی مقامات، شہروں ملکی ماحول پر کیا جاسکتا ہے۔یہی نہیں بلکہ یہ افسانے کسی وقتی حدود سے بھی ماورا ہیں۔یعنی زمانہء قدیم کے کسی اساطیری واقعے کی ضمن میں بھی یہ پورے اترتے ہیں اور پہلی جنگ عظیم، دوسری جنگ عظیم کی وجوہات یا آج کے دور کی قومی ،ملکی اور بین الاقوامی سیاسی اور سماجی صورت حال ان کے احاطے میں آجاتے ہیں۔اس قسم کے افسانوں میں" ارے! کوئی ہے" بہت نمایاں مقام رکھتا ہے۔یہ افسانہ دو کرداروں کے مکالموں پر استوار ہے جس میں اسی اعتبار سے افسانے کے دوسرے عناصر سہی توازن کے ساتھ شامل ہیں۔آج کے دور یا کسی بھی دور کی مفاد پرستی کو احاطے میں لاتے ہوئے لالچ ،حرص و ہوس اور طاقت کے نشے میں چور ایک کردار اور دوسرے اس سے کمزور انسان کے مکالموں اور عمل کو غائب راوی کے صیغے میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ آج کا عالمی

منظر نامہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔افسانے کی ابتداء یوں ہوتی ہے:

"وہ دونوں دور کے پڑوسی تھے۔ایک وقت میں دونوں گہرے دوست ہوا کرتے تھے۔کچھ عرصہ بعد ان کی دوستی ختم ہوئی اوران میں ان بن شروع ہوگئی۔

پھر وہ وقت آیا جب ایک نے دوسرے سے تحکمانہ انداز میں کہا" تم نے فلاں کا کام غلط کیا ہےاور میری مرضی کے خلاف کیا ہے۔اب تمہیں اس کا ہرجانا بھرنا ہوگا۔۔!

" یہ تم کہتے ہوتم ! تم جوکل تک میری مدد کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔میرے معاون اور دوست ہونے کا دم بھرتے تھے۔۔"

" ہاں ! میں تمہارا دوست تھا کل تک۔اس دوستی میں میرا اپنا فائدہ تھا۔میں اپنا فائدہ اٹھا چکا۔اب مجھے تمہاری دوستی کی ضرورت نہیں ہے۔۔"

" اوہ !توتم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔دوست بن کراور دوست بنا کر۔"

"نہیں ! میں نے صرف اپنا فائدہ اٹھایا ہے۔میں نے اپنی ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔۔"

" مگراب جوتم کہہ رہے ہو،اس میں میرا نقصان ہے۔مجھے بھی فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔تم اپنا راستہ ناپو۔۔"

"تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہوں۔بہتر ہے کہ تم میرا کہا مان جاؤ۔میں تمہیں کچھ مہلت دیتا ہوں۔۔"

" مجھے اس کی پرواہ نہیں۔تم دوستی کے نام پر دھبہ ہو۔میں تمہاری پول دنیا کے سامنے کھول دوں گا۔دنیا میرے ساتھ ہوگی۔تم اکیلے پڑ جاؤ گے۔" (ارے ! کوئی ہے )

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ ان کے اس قسم کے افسانے وقت کے برتاؤ کے لحاظ سے کئی جہات رکھتے ہیں۔عصری حسیت کی پیچیدگی اور ٹریٹمنٹ کی فنکاری دیکھی جا سکتی ہے۔ تاریخیت کے لحاظ سے بھی مندرجہ بالا اقتباس کو وقت کے جس سانچے میں چاہے ڈھالا جا سکتا ہے۔ان کے یہاں علامت کی ضروری تجسیم اوراس کے بھرپور اظہار کا جو رویہ ملتا ہے،اس میں الفاظ کا انتخاب ایک شدید تاثر کے ساتھ کامیابی کے مراحل طئے کرتا ہے۔ان کے یہاں علامت جمالیاتی سطح پر بیانیہ کی سادگی کے باوجود قاری کو حیرت میں ڈالتی چلی جاتی ہے اور علامت نگاری اپنی ہیت اور جذباتی تلازمے کی بنا پر اسطور میں بھی منتقل ہوجاتی ہے، جب ہم افسانے کے اختتامی سطور پر غور

کرتے ہیں۔ یہ اختتامی سطور ملاحظہ ہوں:

" دونوں میں پھر ٹکراؤ ہوا۔ پہلے نے اپنے پہلے ہی وار میں دوسرے کے دونوں بازوؤں کو جسم سے الگ کر دیا۔ وہ جواباً زور سے دہاڑا" میں تمہاری ٹانگیں کاٹ کر الگ کر دوں گا۔۔"

اگلے ہی لمحے اس کی اپنی کٹی ہوئی ٹانگیں الگ پڑی تھیں مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ پھر دہاڑا" تم پچھتاؤ گے۔ میں تمہیں منہ کے بل گراؤں گا۔ میں تمہارے دانت توڑ کے رکھ دوں گا۔۔"

اب کے جوابی کاروائی میں اس کے دانت بھی توڑ دئے گئے۔ اب اس کے منہ سے خون ابل رہا تھا مگر اس حال میں بھی بڑبڑایا۔

" میں تمہاری ناک کاٹ دوں گا۔"

اس بڑبڑاہٹ پر اس کی ناک بھی کاٹ دی گئی۔ اب اس کا جسم ابلتے خون کا فوارہ بن کے رہ گیا تھا۔ اب کہ اپنے دائیں بائیں مڑ کر دیکھتے ہوئے وہ لگ بھگ چیختے ہوئے پکارا اٹھا" ارے کوئی ہے۔" وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ اسی لئے کوئی اس کی مدد کو نہیں آ رہا ہے۔ وہ اکیلا ہے اور ایک ظالم کے ہاتھوں پٹ رہا ہے۔۔ مگر اپنے آس پاس دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ وہاں تو ایک ہجوم امڈا پڑا تھا۔ لوگوں کی ایک بھیڑ تھی اور بھیڑ میں خاموشی چھائی تھی۔ اسے غصہ تو بے حد آیا مگر اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے دشمن کی طرف مڑا۔ اپنی بچی کھچی پوری طاقت سے غرایا۔

" کتے، کمینے، شیطان۔۔"

اب کے اس کے دشمن نے اپنے آخری وار سے اسے ہلاک کر دیا۔ اس کا جسم کچھ دیر تڑپا، پھر ساکت ہو گیا۔ بھیڑ ایک دم سے غائب ہو گئی تھی۔ وہاں اب کوئی بھی نہیں ٹھہرا تھا۔"

(ارے! کوئی ہے)

اس طرح ہمارے سامنے دور قدیم سے لے کر دور حاضر تک کی جابر حکومتوں، ظالم حکمرانوں، طاقتور اور جابر فرد کی اصلیت کے ساتھ ساتھ ان مفاد پرستوں کی اصلیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے جو ہر دور میں ہر ملک، شہر، گاؤں، محلوں اور گلی میں ہوتے ہیں اور جن پر اعتماد کا انجام وہی ہوتا ہے جو اس افسانے کے ایک کردار کا ہوتا ہے۔ اس طرح ہمیں زنفر کھوکھر کے افسانوں کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے اور ادب میں ان کی قدر و قیمت کا بھی۔

☆☆☆

Zanfar Khokhar ke Muntakhab Afsane

زنفر کھوکھر کے منتخب افسانے

# ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے

رات کے آٹھ بجے یک بارگی موبائل اور فون دھڑادھڑ بج اٹھے۔" ہیلو، ہیلو" جی فرمایئے!
" آپ اگر ٹی وی دیکھ رہے ہیں تو جلدی سے چینل بدلئے اور آج کل دیکھئے۔" مگر کیوں؟ " ایک خاص پروگرام چل رہا ہے۔ اسٹنگ آپریشن کا۔ دیکھئے تو سہی۔

بس ہر کوئی اپنے اڑوس پڑوس میں اور اپنے چاہنے والوں کو اسی طرح کی اطلاع بہم پہنچا رہا تھا۔ براڈ کاسٹر نے اسٹنگ آپریشن کے ذریعے ایک مخصوص محکمہ کے کئی لوگوں کو رشوت لیتے ہوئے دکھانے کے بعد مذکورہ محکمہ کے ایک سینئر آفیسر سے رابطہ کیا اور پوچھا۔" سر آپ نے ابھی ہمارا اسٹنگ آپریشن دیکھا ہے۔ اب آپ کیا کہیں گے۔"

مذکورہ محکمہ کے سینئر آفیسر نے کہا۔" سب سے پہلے تو میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے ہمارے ان کرپٹ لوگوں کو بے نقاب کیا۔ چونکہ آپ کا یہ اسٹنگ آپریشن اتنا واضح اور مکمل ہے کہ اب اس میں کسی نوٹس، کیس انکوائری یا کسی دیگر ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ میں نے ان لوگوں کے ابھی سسپنشن آرڈر جاری کر دئے ہیں۔ اب ان کے خلاف قانون کے مطابق سخت سے سخت کاروائی ہوگی۔"

براڈ کاسٹر نے کہا۔" سر آپ نے بڑی مستعدی دکھائی ہے۔ شکریہ! آپ سے ایک سوال اور ہے۔ عام طور پر رشوت مانگے جانے پر یا رشوت لئے جانے پر آپ کے محکمے میں ہی جا کر خود پر ہوئی زیادتی کی شکایت کی جاتی ہے۔ مگر جب محکمے کے لوگ خود رشوت لینے کے درپے ہو جائیں تب ایک عام بندہ اس کی شکایت کہاں پہ کر سکتا ہے۔؟"

سینئر آفیسر نے کہا ۔" ہمارے سینٹر آفس کے باہر لگے ہوئے بورڈ پر فون نمبر موجود ہوتے ہیں۔ انہیں نمبرات میں سے کسی بھی نمبر پر فریادی فون کر کے اطلاع دے سکتا ہے۔"

براڈ کاسٹر نے کہا۔" سر آپ نے ہمیں اور ہمارے سننے والوں کو اچھی جانکاری دی۔

شکریہ۔مگر ابھی آپ ہمارے ساتھ رہئے۔ابھی ہمارا اسٹنگ آپریشن جاری ہے،اور ناظرین،آپ بھی ہمارے ساتھ بنے رہئے۔"

اب کہ ٹی وی اسکرین پر رشوت لیتے جو تصویر ابھری وہ کسی اور کی نہیں تھی بلکہ اسی سینئر آفیسر کی تھی جس نے ابھی ابھی اپنے محکمے کے کچھ کرپٹ لوگوں کے سسپنشن آرڈر جاری کئے تھے۔

لاکھوں لوگ جو اس وقت ٹی وی پر یہ پروگرام دیکھ رہے تھے،نہایت سوکھے کا موسم ہونے کے باوجود پانی پانی ہو گئے۔

☆☆☆

# زور کا جھٹکہ

بین الاقوامی معیار کے ایک ادبی جریدے میں اپنی تخلیق شائع ہوئی دیکھ کر وہ پھولے نہیں سمایا۔ ہاتھ میں رسالہ لے کر جگہ جگہ گھومنے لگا۔ دوستو اور چاہنے والوں کو رسالہ کھول کھول کر دکھانے لگا۔

" دیکھو تو! میری تخلیق معہ میری تصویر اس ادبی رسالے میں شائع ہوئی ہے۔"

کوئی دور سے ایک نظر دیکھ لیتا، کوئی رسالہ ہاتھ میں لے کر رہ جاتا تو کوئی رسالے میں چھپی اس کی تصویر غور سے دیکھ کر" اچھی تصویر آئی ہے" کہتے ہوئے اسے رسالہ لوٹا دیتا۔ درجنوں لوگوں میں سے کسی نے بھی تخلیق کو پڑھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔"

یہ مادی دنیا کے لوگ ! ادب سے ناشناس لوگ ! ہیرے کی قدر قدر جوہری کو ہی ہوتی ہے۔ بھلا ادب سے کوسوں دور رہنے والے یہ لوگ کیا جانیں کہ ادب کیا ہے، اور ادیب کیا ہے؟

بقول ایڈیٹر۔" یہ رسالہ لاکھوں کی تعداد میں چھپتا ہے۔۔۔۔ یوں اس کے پڑھنے والے بھی لاکھوں میں ہوں گے۔ وہ مجھے مبارک باد بھرے خط لکھیں گے۔ میری تخلیق کی پذیرائی کریں گے۔۔۔ خیر آج کل قدریں بدل گئی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ لوگ ادیب سے رابطہ رکھنے میں فخر سمجھتے تھے اور ایڈیٹر سے تقاضا کرتے تھے کہ تخلیق کے ساتھ تخلیق کار کا پورا پتہ لکھا جائے تا کہ اسے خط لکھا جا سکے۔ تاہم آج الیکٹرانک زمانہ ہے۔ خطوط کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے فون آئیں گے۔ ایس۔ ایم۔ ایس آئیں گے۔ ای۔ میل آئیں گے۔ ادبی دنیا میں میری تخلیق کی خوب تعریف و توصیف ہوگی۔

مگر یہ کیا ؟۔ مہینہ بھر ہو گیا، اور پھر دو مہینے بھی ہو گئے۔ اور اسے ایک بھی فون، ای میل، ایس۔ ایم۔ ایس وغیرہ بھی نہیں ملا۔۔!

مگر اس نے تو ہر حال میں ایڈیٹر کو شکریہ کا خط لکھنا تھا۔ اور اپنی ساکھ بحال رکھنی تھی۔ اس نے کاغذ قلم ہاتھ میں لیا اور دور تنہائی میں بیٹھ کر خط لکھنے لگا۔

" محترم ایڈیٹر! میں آپ کا بے حد مشکور و ممنون ہوں۔ آپ نے اپنے ادبی رسالے میں میری تخلیق شائع کر کے مجھ پر ادبی دنیا کے در وا کر دئے۔ گویا مجھے فرش سے اٹھا کر عرش پہ پہنچا

دیا۔یقین جانئے گا! میری تخلیق کی تعریف وتوصیف میں ادبی دنیا کے کونے کونے سے ڈھیروں خطوط، ایس۔ایم۔ایس۔، ای میل اور فون آئے ہیں۔اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے جو کسی بھی طرح تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔اب ان سب کو الگ الگ جواب دے پانا میرے لئے بہت مشکل ہے۔اس لئے آپ کے رسالے کے توسط سے اور اس خط کے ذریعے میں ان سب کا یک بارگی شکریہ۔۔۔۔۔

ابھی اس نے آخری جملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ اسے اپنے اندر سے ایک آواز سنائی دی۔

"ذرا ان میں سے چند کے نام بھی لکھ دیجئے۔۔۔!"

بس اسے زوروں کا جھٹکا زوروں سے لگا اور قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

☆☆☆

# آخری فیصلہ

رہ رہ کر آخری میٹنگ ہوئی ۔ادارے کے تیس پینتیس لوگ اپنی اپنی نشستوں پہ براجمان ہو چکے تھے۔ادارے کے افسر اعلیٰ بھی اپنی مخصوص کرسی پر براجمان تھے مگران کا چہرہ ہمیشہ کی طرح تروتازہ اور ہشاش بشاش نہیں تھا۔ایک پژمردگی تھی جو سارے ادارے پر چھائی تھی۔

ادارے میں ایک ایسا ہتک آمیز واقعہ رونما ہوا تھا کہ جس کی جتنی مذمت کی جائے کم تھی۔میٹنگ ہال کے ایک کونے میں وہ گستاخ شخص بھی موجود تھا جس کو لے کر میٹنگ بلائی گئی تھی۔ اسے اپنے کئے پر نہ تو کوئی پچھتاوا تھا اور نہ ہی وہ نادم دکھائی دے رہا تھا۔وہ بس خاموش کھڑا تھا۔

افسر اعلیٰ نے اپنے ادارے کے ایک ایک فرد کو سنا۔یوں تو وہ گذشتہ دو تین دن سے بھی انہیں سن رہے تھے۔ہر شخص کی ہمدردی اور تعاون افسر اعلیٰ کے ساتھ تھا۔ہر شخص مجرم کے خلاف تھا اور اسے کڑی سے کڑی سزا دلوانا چاہتا تھا۔

اگر چہ افسر اعلیٰ بات کو بڑھانا نہیں چاہتے تھے مگر ادارے کے سبھی ملازمین نے انہیں کہہ دیا تھا کہ جب تک مجرم کے خلاف کاروائی نہ کی جائے ،وہ چین نہیں پائیں گے۔کیوں کہ آج جوان کے ساتھ ہوا، وہ کل کسی اور کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔

اسی لئے میٹنگ منعقد کر کے مجرم کو سب کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔اب میٹنگ میں ہر شخص کا بیان تھا کہ مجرم کو نہ صرف ادارے سے نکال دیا جائے بلکہ اس کی گستاخانہ حرکت پر اس کے خلاف مقدمہ بھی دائر کیا جائے۔کیوں کہ مجرم نے بغیر کسی وجہ کے نہایت ہی افسوس ناک حرکت کی تھی۔اس نے نہ صرف اپنے افسر اعلیٰ کا حکم ماننے سے انکار کیا تھا بلکہ تو تو میں میں بھی کی تھی۔بات یہیں پر ختم ہو جاتی تب نا۔اگلے روز جب آفس کھلا تو سب نے دیکھا،اس نے اپنے افسر کے لئے باقاعدہ گالیوں کا اشتہار بنا کر ادارے کے در و دیوار پر چسپاں کئے تھے۔

ایک چوتھے درجے کا ملازم ہو کر کتنی مذموم حرکت کی تھی اس نے۔اسی لئے تو ہر کوئی چاہتا تھا کہ اس کے خلاف عزت ہتک کا مقدمہ دائر کیا جائے۔سبھی نے اپنے افسر اعلیٰ کو اپنا بھرپور تعاون دینے کی بات کہی تھی۔افسر اعلیٰ نے سب کو بغور سنا۔سب کی ہمدردیاں افسر اعلیٰ کے ساتھ تھیں۔ہر

کوئی چاہتا تھا کہ میٹنگ میں ایک قرارداد پاس کر کے اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے۔

باری باری سب کو سن لینے کے بعد افسر اعلیٰ نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

" میں آپ سب کا شکر گزار ہوں۔ آپ کی ہمدردی اور خلوص کی قدر کرتا ہوں۔ اور آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ آخری فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیں۔

میں آپ سب کی موجودگی میں مجرم کو اپنے دل کی گہرائیوں سے معاف کرتا ہوں اور میٹنگ برخاست کرتا ہوں۔

☆☆☆

# ارے! کوئی ہے!

وہ دونوں دور کے پڑوسی تھے۔ ایک وقت میں دونوں گہرے دوست ہوا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی دوستی ختم ہوئی اور ان میں ان بن شروع ہوگئی۔

پھر وہ وقت آیا جب ایک نے دوسرے سے تحکمانہ انداز میں کہا" تم نے فلاں کا کام غلط کیا ہے اور میری مرضی کے خلاف کیا ہے۔ اب تمہیں اس کا ہرجانا بھرنا ہوگا۔۔!

" یہ تم کہتے ہو تم ! تم جو کل تک میری مدد کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ میرے معاون اور دوست ہونے کا دم بھرتے تھے۔۔"

" ہاں ! میں تمہارا دوست تھا کل تک۔ اس دوستی میں میرا اپنا فائدہ تھا۔ میں اپنا فائدہ اٹھا چکا۔ اب مجھے تمہاری دوستی کی ضرورت نہیں ہے۔۔"

" اوہ ! تو تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ دوست بن کر اور دوست بنا کر۔"

"نہیں ! میں نے صرف اپنا فائدہ اٹھایا ہے۔ میں نے اپنی ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔۔"

" مگر اب جو تم کہہ رہے ہو، اس میں میرا نقصان ہے۔ مجھے بھی فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔ تم اپنا راستہ ناپو۔۔"

"تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم میرا کہا مان جاؤ۔ میں تمہیں کچھ مہلت دیتا ہوں۔۔"

" مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ تم دوستی کے نام پر دھبہ ہو۔ میں تمہاری پول دنیا کے سامنے کھول دوں گا۔ دنیا میرے ساتھ ہوگی۔ تم اکیلے پڑ جاؤ گے۔"

" تمہاری مہلت ختم ہونے کو ہے۔ میرے مقابلے میں تم چھوٹے ہو۔ بری طرح پٹ جاؤ گے۔ میرے حکم کی تعمیل کرو، ورنہ۔۔"

" ہرگز نہیں۔ دنیا اب تمہاری مکاریوں سے واقف ہو چکی ہے۔ دنیا میرے ساتھ ہوگی۔ تم اکیلے پڑ جاؤ گے۔۔"

"مگر کیا تم جانتے نہیں! میں اکیلا ہی سب پر بھاری ہوں۔۔"

"تم جو بھی ہو، میری بلا سے۔ میں تمہیں ڈھیر کر دوں گا۔۔"

"تم چھوٹے ہو کر بڑی ہانک رہے ہو۔ تمہاری مہلت ختم ہو چکی ہے۔ اب میں تمہیں مزید مہلت دیتا ہوں۔ سوچ لو۔۔!"

"میں سوچ چکا۔ تمہیں مزہ چکھاؤں گا۔ تمہارے دانت توڑ کے رکھ دوں گا۔۔"

"میرے دانتوں تک تمہاری رسائی ناممکن ہے۔ میں طاقت کی سب سے اونچی چوٹی پر براجمان ہوں۔ اور لو! اب تمہاری آخری مہلت بھی ختم ہوئی۔۔"

اس تکرار کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سے آگے بڑھے۔ دونوں کے بیچ محاذ آرائی اور مقابلہ شروع ہوا۔ دنیا والوں میں سے کسی نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ لڑنے والوں کا ساتھ کوئی نہیں دیتا ہے۔ صرف تماشا دیکھا جاتا ہے۔ دنیا والے دونوں کا تماشا دیکھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو گئے کہ دونوں میں سے کون کسے مار بھگاتا ہے۔ کون جیتتا ہے اور کون ہارتا ہے۔

پہلے نے دوسرے کے سر پر کئی تابڑ توڑ وار کئے۔ اس کا انگ انگ لہولہان ہو گیا۔ مگر وہ قہر برپا کر دینے والے انداز میں دہاڑ کر بولا۔

"میں تمہیں سبق سکھاؤں گا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔ تمہیں اپنے قدموں تلے روندوں گا۔۔"

دونوں میں پھر ٹکراؤ ہوا۔ پہلے نے اپنے پہلے ہی وار میں دوسرے کے دونوں بازوؤں کو جسم سے الگ کر دیا۔ وہ جواباً زور سے دہاڑا۔" میں تمہاری ٹانگیں کاٹ کر الگ کر دوں گا۔۔"

اگلے ہی لمحے اس کی اپنی کٹی ہوئی ٹانگیں الگ پڑی تھیں مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ پھر دہاڑا۔" تم پچھتاؤ گے۔ میں تمہیں منہ کے بل گراؤں گا۔ میں تمہارے دانت توڑ کے رکھ دوں گا۔۔"

اب کے جوابی کاروائی میں اس کے دانت بھی توڑ دئے گئے۔ اب اس کے منہ سے خون ابل رہا تھا مگر اس حال میں بھی بڑبڑایا۔

"میں تمہاری ناک کاٹ دوں گا۔"

اس بڑبڑاہٹ پر اس کی ناک بھی کاٹ دی گئی۔ اب اس کا جسم ابلتے خون کا فوارہ بن کے رہ گیا تھا۔ اب کہ اپنے دائیں بائیں مڑ کر دیکھتے ہوئے وہ لگ بھگ چیختے ہوئے پکار اٹھا۔" ارے کوئی

ہے۔"

وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔اسی لئے کوئی اس کی مدد کو نہیں آ رہا ہے۔وہ اکیلا ہے اور ایک ظالم کے ہاتھوں پٹ رہا ہے۔۔مگر اپنے آس پاس دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔وہاں تو ایک ہجوم امڈا پڑا تھا۔لوگوں کی ایک بھیڑ تھی اور بھیڑ میں خاموشی چھائی تھی۔

اسے غصہ تو بے حد آیا مگر اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔وہ اپنے دشمن کی طرف مڑا۔اپنی بچی کھچی پوری طاوت سے غرایا۔

"کتے، کمینے، شیطان۔۔"

اب کے اس کے دشمن نے اپنے آخری وار سے اسے ہلاک کر دیا۔اس کا جسم کچھ دیر تڑپا، پھر ساکت ہو گیا۔بھیڑ ایک دم سے غائب ہو گئی تھی۔وہاں اب کوئی بھی نہیں ٹھہرا تھا۔

☆☆☆

kashmiri mein silsila-e-reshi ka ijmaali jaeza by Mohd. Javaid(research Scholar, Centre of Persian & Central Asian Studies JNU (New Delhi)
محمد جاوید (ریسرچ اسکالر سینٹر آف پرشین اینڈ سینٹر آف ویسٹ ایشین سٹڈیز دانشگاہ جواہر لعل نہرو)

# کشمیر میں سلسلہ ریشی کا اجمالی جائزہ

**چکیدہ:** اسلام رہبانیت اور ترک دنیا کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر اسلامی دور میں بھی مسلمان ہونے کے باوجود ریشی حق کی تلاش میں یہی طریقے کیوں اپناتے رہتے ہیں جسکی وجہ یہ ہے کہ کشمیری برہمنوں کے عقیدے کے مطابق بالعموم اور بدھ مت۔ روحانی حصول کے لیے خودکشی کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، شیخ العالم کے زمانے سے یہاں برہمنوں کے علاوہ اور ان کے بہت سے عقائد کو نوسو سال تک بدھ فلسفے کے اثرات پھلا دیے گئے۔ یہ اثرات کشمیریوں کے اجتماعی لاشعور میں بس چکے تھے اس وراثت میں عدم تشدد، خودکشی، عوامی فلاح و بہبود، بھائی چارہ، رواداری ایسے عملی عقائد تھے کہ تمام کشمیری بدھ ان سے محبت کرتے تھے۔ شیخ العالم نے کشمیر میں نسل پرستی کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور خلوت کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کو فروغ دینا شروع کیا جس کے نتیجے میں لوگوں نے رہبانیت ترک کر کے اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے لگے۔ انہوں نے پیغام حق کو دور دور تک پھیلانے کے لیے کشمیری زبان کا استعمال کیا جو لوگوں کی مادری زبان تھی ان کی تقریر آج بھی کشمیر میں پڑھی اور لکھی جاتی ہے اور اس کی مختلف زبانوں میں تشریح کی گئی ہے۔ ان کی تقریر کو پہیلی کہا جاتا ہے۔

**کلیدی الفاظ:**
اسلام، رہبانیت، ریشی، شیخ العالم، بدھ مت، برہمن، فلاح، بھائی چارہ، رواداری، لباس، خانقاہ، کڑواساگ، غار، کشمیری زبان وغیرہ وغیرہ۔

**تعارف:**

جب کشمیر کی دلپذیر وادی میں اسلام آیا تو لوگوں کے ساتھ ریشیان کشمیر بھی اس دین میں داخل ہو گئے تھے۔ پھر یہی ریشیت جو صدیوں سے اپنا ایک الگ طریقہ عبادت رکھتی تھی اسلامی تصوف کا

ایک نمایاں حصہ بن گئی۔اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئی اور پھر اس کا رنگ اختیار کیا۔تاہم ان حضرات کا اپنا قدیم نام اپنی جگہ قائم رہا۔یعنی وہ پھر بھی ریشی ہی کہلائے اور ان کی الگ اپنی شناخت بھی برابر قائم رہی ہے۔ ہاں اس میں انقلاب آیا۔ ان کی عبادات، طرز زندگی اور غارنشینی وغیرہ سب میں اعتدال دیکھی جاتی ہے۔ کیونکہ اسلام نے قدیم ریشیت پر اپنا زبردست اثر چھوڑا اور ریشیت کو شریعت کے تحت لایا۔اب ریشی شریعت سے بال برابر بھی ہٹ کر کوئی عبادت نہیں کرسکتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ریشیوں نے اب سنت نبوی ﷺ کے مطابق اپنی عبادات کا آغاز کیا تھا۔گوشہ گیری میں بھی حدود قائم کی گئی جس سے آگے بڑھ نہیں سکتے تھے۔اسلام نے ریشیت میں مکمل پاکیزگی لائی۔قدیم ریشیوں کی طرح اب کوئی ریشی ننگے بدن ہوکر نہیں چل سکتا تھا اور میل کچیل کو دھوڈالتا تھا۔ اب وہ موٹے قسم کا لباس بھی پہنتے تھے اور غسل بھی کرتے تھے۔شب وروز باوضو رہتے تھے،

مسلمان ریشیوں نے شریعت کے مطابق ریشیت میں تصوف کی روح پھونک دی۔اس میں روحانی بالیدگی کے ساتھ جسمانی صفائی اور پاکیزگی خود بخود آئی ہے۔ اب ریشیت میں نہ گھبراہٹ رہی اور نہ اداسی بلکہ مسلمان ریشی مصائب اور آلام کو خدا کی رحمت جان کر خوشی سے قبول کر لیتے ہیں اس پاکیزہ کردار جماعت کے قائد نامدار شیخ نورالدین ولی کشمیری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔جن کو عرف عام میں شیخ العالم اور علمدار کشمیر بھی کہتے ہیں۔آنجناب نے ریشیان کشمیر کی رہنمائی فرمائی ہے۔جس کی بناء پر وہ سب خدمت خلق اور عزت نفس کو اولین ترجیح دیتے تھے۔حضرت شیخ العالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ریشیت کو تصوف کا رنگ و بو عطا کیا اور پھر حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کو برابر کا درجہ دیا اور کما حقہ ادا فرمائے تھے۔اب ہم یہاں ریشیت پر ایک اور تاریخی نظر ڈالیں اور دوسرے زاویہ سے دیکھ لیں کہ مسلمان مفکروں۔ نے اس کے بارے میں کیا کچھ کہا ہے۔لفظ ریشی کسی زبان کا لفظ ہے؟ اس کا معنی ومفہوم کیا ہے اور پھر تصوف کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہے؟

**ریشیت کی تعریف:** خواجہ اعظم دیدہ مری ریشیوں کی تعریف لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ریشی کے را گویند کہ از زمرہ زاہدان وعبادان در ریاضت سخت وصعب تر باشد وخود را از اولا دواز واج فارغ دارد دوست از جمیع آرزوہا وہوس برادر وچہ جائی ملک ومالک۔صاحب ''روضۃ الابرار'' مولوی محمد دین حنفی ریشیت کی تاویل اور توضیح زیادہ صراحت سے کرتے ہیں۔وہ لکھتے ''باید دانست کہ لفظ ریشی معرب یا مفرس از لفظ ''رکھی'' است کہ در سنسکرت تارک دنیا ومشغول بخدا را گویند واہل اسلام در معانی آں قدرے تغیر دادہ باینطور بیان می کنند او اولاد و ازواج ومال ومنال ومتعہ واقمشہ واراضی ومواشی

وغیرہ راترک نمودہ درزاہدوریاضت ودرتقوی وعبادت ومحسن تہانے شاقہ بکار بردودرکوہ ہاوغار ہاودر بہاءسکونت نماید دانسان وحیوان وحش وطیور وہوام حتیٰ کہ سبز وونباتات راایزانرساندوبسوے حق تعالی بفرائض وواجبات ونست ونوافل وسکونت وخلوت وسہروجوع تقرب جوی وتوبہ وصدق وصداقت ذکروفکروخشوع وخضوع وحضورقلب راوسیلہ خودساز وازحرکت زبان بقلقلہ اسان درگرزرد و صرف درمعانی وحدت مستغرق شودو بہ مرتبہ ذخرراحتہ واصل گردواز جمیع اشیا ظاہری و باطنی تانکہ ازنفس خود غیب وفانی گردو بحق باقی شودوازآبہائے جاری وسبزہ ہائے بیابانی مثل کاسنی وایل ساگ قوت نماید"

حاجی محی الدین لفظ ریشی کی تعریف یوں کرتے ہیں۔لفظ ریشی از لفظ رکھی کہ دراصطلاح سنسکرت تارک الدنیاومشغول بیادخدا گویند۔

بابا کمال ریشیوں کی تعریف یوں بیان فرماتے ہیں:اماریشی کسے راگویند کہ مجتنب اززن وفرزند باشدآزارنمی دہدو ہیچ جاندار یراہراپامال نہ کند برسبزہ زارے نرودوخلوت گزیند دراما کن ولیکن ایجاز این طریق ازاول بنیادملک کشمیراست۔

**سلسلہ ریشی کی پانچ مینار:** سلسلہ ریشی کے نور،''شیخ نورالدین'' صبح روشن،''بابا بام الدین''زیب و زینت،''بابا زین الدین''فتح و نصرت،''بابا نصیرالدین''نرمی و نازاکت،''بابا لطیف الدان'' شیخ نورالدین ولی کی ولادت ۷۵۷ھ دس ذی الحج کو ہوئی۔آپ کوعلمدار کشمیر ولی کامل، عارف ربانی، شیخ العالم وغیرہ کے القابات سے پکارا جاتا ہے، ہندوؤں کے ہاں آپ کو''نندوریشی،سنہر ارشی''کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔رشی کے معنی کشمیری زبان میں تارک الدنیااورفنافی اللہ کے ہیں۔آپ کے والد کا نام سالاردین اوروالدہ کا نام صدرہ موجی تھا۔آپ کا بچپن جوبہ سے کم نہ تھا پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ نہیں پیا جس سے ماں کو بہت تشویش ہوئی ایک دن لالہ عارفہ آئیں اور بچے کو گود میں لیااوراس کے منہ میں اپنا دودھ ڈالا اور بچے سے کہا کہ ''چیہ مالینہ چیہ،زینہ مند چھا کنہ تہ چینہ چھوکھ مند چھان''یعنی پی بیٹے پی۔تم جننے سے نہ شرمائے اب پینے سے کیا شرماتے ہو۔

یہ باتیں سن کر شیخ العالم نے دودھ پینا شروع کیا۔آپ کم سنی میں ہی پاکیزہ اطوار اور پسندیدہ کردار کے حامل تھے جوانی میں قدم رکھا تو ذکر فکر میں مشغول رہتے تھے دنیوی کام میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔وہ ابتدا سے ہی خرافات و بدعات سے بیزار تھے۔صرف یاد خدا سے دل میں سکون پاتے تھے اسلئے سوتیلے بھائیوں نے اپنے سے الگ کر دیا تھا۔آپ کی شادی ترال کے اکبر دین کی لڑکی سے ہوئی تھی اس سے آپ کی اولاد بھی ہوئی لیکن پھر بھی دنیا سے متنفر ہی رہے یوں بچپن اور جوانی

یادخدا میں گزاری اس زمانہ میں بھی آپ کی کرامات رہی ہیں۔اس زمانہ میں لکھنے کا رواج بہت کم تھا اسلئے آپ کی کرامات ذہنوں میں ہی ثبت وضبط ہوجاتی تھیں اوران کی کوئی خاص تاریخی سند نہیں پھر بھی کئی کرامات واقعیت سے خالی نہیں ہے شیخ العالم کے کلام سے ان کے رتبہ کا اندازا لگایا جاسکتا ہے اوران کے حقیقت پسندانہ معیار کو قائم کیا جاسکتا ہے۔ان کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنے سے ہوتا ہے کہ وہ محض کنج نشینی کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ عملی زندگی میں لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ حکمرانوں اور حاکموں کو انصاف کی تلقین کرتے اور ظلم و جبر سے منع کرتے۔اس بارے میں آپ کسی مصلحت کا شکار نہ ہوتے تھے۔

بادشاہوں کی شدت پسندی کے خلاف صف آرا ہوتے۔یہی وجہ ہے کہ مختلف بادشاہوں نے آپکی سرگرمیوں کو مخصوص نظر سے دیکھا۔بقول جون رنج، سلطان سکندر نے شیخ العالم کو اسی بات پر جیل بھی بھجوایا تھا۔شیخ العالم ایسے مرد کامل تھے کہ جنہوں نے کشمیری تہذیب وتمدن پر بہت گہرے نقوش چھوڑے۔آپ کے کام کو بابا قطب الدین نے ''بوج پتروں'' پر تحریر کیا۔اسکے بعد سلطان زین العابدین کے دربار کا ایک اہم وزیر جب شیخ العلم کا مرید بنا تو اس نے اس کام کو فارسی رسم الخط میں ڈھالا۔اوراس کو ''نورنامہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔اس وقت جتنا بھی آپ کا کلام دستیاب ہے وہ صرف کت پنڈت، کی محنت اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔آپ کے ریشی پن کا بہترین اظہار آپ کا کام ہے کیونکہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے آپ کے رتبے کا تعین کیا جاسکتا ہے۔لیکن آپ کا کلام اس وقت مرتب نہ کیا جاسکا بعد میں بابا نصیب الدین غازی نے آپ کے وصال کے سوسال بعد ریشی نامہ لکھا اور آپ کے کشف وکرامات کے بارے میں وضاحت کی ہے۔آپ کا کلام آج زندہ جاوید ہے اور راہ حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔کلام شیخ العالم کے اولین ترتیب کار حضرت بابا قطب الدین نے ''بوج پتروں'' پر تحریر کیا تھا جو اس کی سمجھ میں آچکا تھا۔اس کا نام ''نورنامہ'' رکھا۔ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ کلام شیخ العالم صرف کشمیری زبان میں ہی نہیں لکھا گیا بلکہ فارسی، عربی، اور سنسکرت، کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی لکھا گیا ہے۔اوراب اس کا ترجمہ اردو زبان میں بھی کئی اسکالروں نے کیا ہے ''حیات شیخ العالم'' اسداللہ آفاکی کی بہترین تصنیف ہے۔شیخ العالم نے اپنے کلام کے شروع میں اللہ تعالی کی حمد وثنا کچھ اس طرح کی ہے۔

خدا تعالی اوس نہ آسی سہ ینیہ ارت کانسہ نہ
نکس دینہس روزی آسی اسی تسہ زینتس سہ اسہ نہ

خداوند کریم خوش وخرم قائم ہے۔اس کو کسی سے کوئی حاجت نہیں ہے۔جس کو جتنی روزی لکھی ہوا تنا اس کو پہنچا دیتا ہے۔اس کو ہماری فکر ہے،لیکن ہمیں اس کی فکر نہیں۔

شیخ العالم کے چار اہم خلیفہ:

**بابا بام الدین:** آپ شیخ نورالدینؒ کے پہلے مرید تھے، بام الدین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بارہ سال تک زندہ رہے، چونا پتھر اور پانی کو بطور خوراک کھاتے رہے۔ بظاہر یہ ایک مبالغہ آرائی ہے،لیکن کم از کم تقویٰ کی شہرت کی بات کرتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اپ نے کوئی نوکر نہیں رکھا اور نہ ہی مناسب رسوء رکھنے کے بارے میں خود کو پریشان کیا۔ بام الدین نے اپنے مرشد کی طرح تنہائی کی تلاش کی۔ جب علی شاہ (بادشاہ) (1413-1420) نے ان سے ملنا چاہا تو اس نے کہا کہ اگر یہ دورہ واقعی ضروری ہے تو وہ اپنے شاہی لباس میں نہ آئیں۔سلطان نے ایک کسان کے لباس میں بام الدین کے پاس حاضری دی۔اس پر بام الدین نے کہا کہ تم نے بادشاہ کا لباس تو اتار دیا،لیکن تم نے اپنی بادشاہت کی فکر سے دماغ نہیں نکالا،تم نے اپنے کانوں سے غفلت کی روئی اتارنے سے انکار کر دیا تو کیا فائدہ؟ حکمرانوں کی فطرت آگ جیسی ہوتی ہے اور اولیاء کی نصیحتیں ہوا کی طرح ہوتی ہیں، آگ ہوا میں بھڑک اٹھتی ہے۔سلطان نے پھر پوچھا کہ کیا آپ اس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟ بام الدین نے جواب دیا:''نہیں،،اور نہ ہی مجھ سے دوبارہ ملنا،اور اپنے دربار میں میرا نام بھی نہ لینا۔" سلطان نے جواب دیا:"تمہاری عام آدمیوں سے کتنی گہری دشمنی ہے۔"جواب ملا:"صرف اس لیے کہ میں دنیاداری کا دشمن ہوں۔"جب سلطان چلا گیا تو بام الدین نے وہ چٹائی جس پر سلطان بیٹھا تھا، دریا میں پھینک دی، بام الدین کو ۱۴۲۰ عیسوی میں بامقام بامزو دفن کیا جہاں اس نے اپنے بتوں کی دیکھ بھال کی تھی اور ایک مسلمان ریشی کے طور پر بھی عبادت کی تھی۔قریب ہی ایک غار ہے جس میں چونا پتھر کا کئی صدیوں پرانا مندر اب بھی موسم کی خرابی کے باوجود غیر محفوظ کھڑا ہے۔

**بابا زین الدین:** شیخ نورالدین کے تمام شاگردوں میں سب سے زیادہ ممتاز زین الدین تھے۔انہوں نے تقویٰ اور کفایت شعاری کی وجہ سے بڑا نام کمایا۔شیخ نورالدین نے ان کا بہت احترام کیا اور اپنے ایک قول میں انہیں شاندار خراج عقیدت پیش کی:''میرے زینہ (زین الدین) لافانی پانی کا چشمہ ہے، اللہ تعالیٰ سے اس کی عقیدت ایسی ہے۔کہ وہ اپنے پیر سے بالاتر ہے۔" کئی سال تک اپنے مرشد کی خدمت کرنے کے بعد، زین الدین اپنے شیخ کے حکم سے عیش مقام چلا گیا اور وہیں ایک غار میں ٹھہرا۔ بہت سے دوسرے رشیوں کی طرح، اس نے خود کو سادگی اور برہمی کی زندگی پر لاگو کیا اور

عبادت کی وہ شکلیں اختیار کیں جنہیں رشیوں نے زیادہ موثر سمجھا۔ زین الدین کے بہت سے معجزات کا ذکر ہے اور ان کا مزار عیش مقام میں ہے۔

**بابا نصر الدین:** ان سے بھی بہت سے معجزات منسوب ہیں۔ وہ ایک امیر آدمی تھے۔ دنیاوی خواہشات کو چھوڑ کر سادگی اپنائی اسے پوشکر میں دفن کیا گیا۔ اسی طرح بابا نصر الدین نے دنیا کو خیر باد کہا اور آخری دن تک شیخ نور الدین کی خدمت میں رہے۔ ان کے نام پر شیخ نور الدین نے بہت سے "شلوک" بیان کیے، بابا نصر الدین چرار شریف میں شیخ نور الدین کے جانشین بنے اور 855 ہجری کو بابا کا انتقال ہوا۔ 1451ء میں چرار شریف میں اپنے مرشد کے پاس دفن کیا گیا۔ وہ دوسرے رشیوں کی طرح روزہ رکھتا تھا اور صرف جنگلی سبزیاں کھاتا تھا جس کی وجہ سے اس نے اپنے آپ کو اس حالت میں لایا تھا، اس کی جلد اور ہڈیاں کم ہوگئی تھیں۔ کیام الدین نے روتے ہوئے کہا: میں اتنا پڑھا لکھا نہیں ہوں کہ کسی کو سکھا سکوں، میں نے قرآن پڑھا ہی نہیں، اگر ہو سکے تو خدا کے قریب ہو جاؤں، مگر اپنے آپ کو کمزور کرنے کے لیے، کھانا چھوڑ دوں اور اس طرح میں اپنے گناہوں کو معاف کرنے کے لئے خدا کو تحریک دے سکتا ہوں ان کا انتقال منزگام میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔۔ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے پیشوا سے زیادہ زندہ رہا۔

**بابا لطیف الدین:** لطیف الدین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ماروا ڈوین (موجودہ اننت ناگ) کا سردار تھا اور اس نے ایک دن شیخ نور الدین سے ملاقات کی، جنہوں نے اس دورے کا مقصد پوچھا، تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ ان سے دوستی چاہتے ہیں۔ نور الدین نے جواب دیا کہ جب تک وہ اسلام قبول نہیں کرتے ان کے درمیان دوستی نہیں ہو سکتی۔ لطیف الدین نے وادع کیا اور شیخ کے مرید ہو گئے۔ خونی گائے کی کھال میں ملبوس بھوما سادھ (بام الدین) کے قریب نور الدین کی کہانی شیخ کے کردار سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی۔ روایت ہے کہ شیخ نور الدین نے اسلام قبول کروانے کو زین الدین کی مدد کی شرط قرار دیا، جب وہ بیمار تھا تو یہ بھی نور الدین کے انسانی ہمدردی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ملا احمد بن صابر کہتے ہیں کہ زین الدین ایک پیر کی تلاش میں تھے، جب وہ نور الدین سے ملے اور ان کے مرید بن گئے۔ اس کا اثر نور الدین کے معروف کردار سے بہتر ملتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ تمام کہانیاں نور الدین کے جوش اور تبلیغی جذبے کو ثابت کرنے کے لیے من گھڑت بنائی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک بار کہا تھا، "میں کسی کے خلاف متعصب نہیں ہوں اور میں کسی پر اثر انداز ہونے کی کوشش بھی نہیں کرتا ہوں۔" اپنے اقوال میں، وہ لوگوں کو امن سے رہنے کی سختی سے نصیحت

کرتے ہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو بھائیوں کی طرح رہنے کو کہتے ہیں۔ زیادہ امکان ہے کہ نورالدین کی سادگی، انسانوں سے محبت اور انسانی دکھوں سے ہمدردی نے دوسری برادریوں کے لوگوں کو متاثر کیا اور بہت سے لوگ ان کے مرید بن گئے اور بعد میں اسلام قبول کیا۔

**نتیجہ گیری:** کشمیر میں ریشیت جس طرح داخل ہوئی تھی اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ صرف رہبانیت اور ترک دنیا کا نام تھا لیکن جب کشمیر میں اسلام کی آمد ہوئی تو اس تصور میں یکسر تبدیلی رونما ہونے لگی اور عوام کو اس بات کا احساس ہوا کہ اللہ کی بندگی کے لئے ہم نے جو طریقہ ایجاد کیا تھا وہ سراسر کفر و ذلالت پر مبنی تھا شیخ العالم کے تبلیغ اسلام کے خاطر خواہ نتائج نکلنے کے ساتھ ساتھ ریشی سلسلہ یہاں زیادہ مستحکم اور مقبول ہونے لگا یہاں تک کہ شیخ العالم کی ذات گرامی اور آپ کی روحانی پاکیزگی، خلوص عمل اور قول و فعل کی یک رنگی لوگوں کو جوق در جوق کو اسلامی تعلیمات کی طرف متوجہ کرانے میں کامیاب ہوئی۔ نہ صرف عام لوگ بلکہ اعلیٰ پایہ کے عابد و زاہد اور برگزیدہ شخصیات بھی آپ کی گرویدہ ہوگئیں۔ ہندوؤں کا مشہور گرو بومہ سادھ آپ کی روحانی پاکیزگی کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیتا ہے اس کے علاوہ سینکڑوں لوگ مسلمان ہوتے ہیں نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی آپ کی تعلیمات کی وجہ سے عالی مقامات پر پہنچ گئیں۔ شیخ العالم کے مریدین نے اپنی کشمیری شاعری کو ریشی تعلیم کے پھیلانے کا ذریعہ بنایا اور اس سلسلہ کو مقبول بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ شیخ العالم کی تعلیمات کا اثر ان لوگوں پر بھی پڑا جو ریشی سلسلہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور کشمیر کی صوفیانہ شاعری پر آپ کے اثرات غالب رہے۔ بہت سے کشمیری صوفی شعراء براہ راست آپ کی تعلیمات سے استفادہ کرتے رہے۔ کشمیر کی مجلسی زندگی اور طرز بود و باش میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ سماجی محفل ہو یا شادی و غمی کا موقع یا مجلس وعظ آپ کے اشلوک کا استعمال کیا جاتا ہے۔ واعظین اپنے وعظ کو ان اشلوکوں سے پر تاثیر بناتے ہیں۔ شعراء عوام کے سامنے یہ اشلوک پڑھ کر لوگوں کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی کا نقش بٹھاتے ہی۔ آپ کا کلام ''ریشی نامہ'' اس وقت مختلف لوگوں کی طرف منسوب ہو کر منظر عام پر آچکا ہے لیکن اس کی تشریح و توضیح کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ کلام کشمیری زبان میں ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہے اس کے علاوہ آپ کی دینی و سماجی خدمات پر مستقل تحقیق کی ضرورت ہے۔

**کتابیات:**

ا: آفاقی اسداللہ، حیات شیخ العالم۔

۲: اسیر ولی محمد، تاریخ اولیاء جموں و کشمیر۔
۳: جیلانی محمد مشتاق، اسلام اور کشمیر۔
۴: دیدی مری خواجہ محمد اعظم، واقعات کشمیر۔
۵: طاہر پیرزادہ عبدالالخالق، سرخیل ریشیان کشمیر۔
۶: قاری سیف الدین، گلدستہ کلام شیخ العالم۔
۷: کھویہامی حسن شاہ، تذکرہ اولیاء کشمیر اردو ترجمہ پروفیسر شریف حسین قاسمی۔
۸: مسکین محی الدین، تاریخ کبیر۔
۹: محمد یوسف، شیرازہ شیخ العالم
۱۰: نورنامہ، ترجمہ ابونعیم۔

☆☆☆

Kashmir ke tahzeeb-o- tamaddun ki behtri ke liye Farsi zaban-o-Adab ke Danishvaraan ke kaarname by 1. Mohd. Javaid 2. Mohd. Akram (Research Scholars, Central of Persian & Central Asian Studies JMI (New Delhi)

**۱: محمد جاوید ۲: محمد اکرم**
(ریسرچ اسکالرز سینٹر آف پرشین اینڈ سینٹر آف ویسٹ ایشین سٹڈیز دانشگاہ جواہر لعل نہرو)

## کشمیر کے تہذیب وتمدن کی بہتری کیلئے فارسی زبان وادب کے دانشوران کے کارنامے

بہ نام خدائی کہ جان آفرید زمین وزمان ومکان آفرید

کشمیر اور ایران کے درمیان قدیم عرصہ سے تعلقات برقرار رہے ہیں جس کے نتیجے میں کشمیر میں فارسی زبان کا رواج ہوا۔ پورے ایشیاء میں کشمیر ایک ایسا خطہ ہے کہ جہاں اسلام کی اشاعت بھی فارسی زبان وادب کے توسط سے ہوئی۔ کشمیر میں اسلام زور زبردستی سے نہیں بلکہ ایران وترکستان سے آئے ہوئے مبلغین کی وجہ سے ہوا۔ ان مبلغین نے نہ صرف کشمیر میں اسلام کی اشاعت کی بلکہ کشمیر کے لوگوں کو بڑے بڑے ہنروں سے متعارف کروایا۔ ایران اور کشمیر میں قدیم رابطے کا سبب میر سیّد علی ہمدانی تھے۔ آپ کشمیر میں اپنے ساتھ سات سو لوگوں کے ساتھ وارد ہوئے جن میں علما، شعرا، ادبا کے علاوہ ماہر تجربہ کار فنکار اور نقاش وغیرہ بھی شامل تھے۔ میر سیّد علی ہمدانی نے کشمیر میں شریعت اور طریقت کے کام کے ساتھ ساتھ سرینگر میں مشہور خانقاہ معلّٰی کو ایرانی طرز پر تعمیر کروایا۔ میر سیّد علی ہمدانی کے ہمراہ آئے ہوئے ماہرین کو میر سیّد علی ہمدانی نے کشمیر کے لوگوں کو مختلف ہنر سیکھانے کے لئے چھوڑ دیا۔ ان ماہرین نے کشمیر کے لوگوں کو پشمینہ سازی، قالین بانی، شال بافی، خوش نویسی، لکڑی پر نقاشی، چاندی اور سونے کے ظروف اور دیگر کئی طرح کے کاموں سے روشناس کیا۔ علامہ اقبال اس سلسلے میں فرماتے ہیں۔

مرشد آن کشور مینو نظیر میر ودرویش وسلاطین رامشیر
خطّہ وا آن شاہ دریا آستین داد علم وصنعت وتہذیب ودین
آفرید آن مرد ایران صغیر باہنرھای غریب و دلپذیر ۔۱

کشمیر میں جب فارسی زبان وادب کے چاہنے والوں، فارسی دانوں کو دیکھا جائے تو کشمیر

کی تہذیب وتمدن کی بہتری کے لئے انہوں نے ہر ممکنہ کوشش کی۔ یوں تو کشمیر اپنے قدرتی حسن کی وجہ سے بہت خوبصورت اور حسین ہے۔ جس وجہ سے کشمیر لاکھوں لوگوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھتی ہے۔ البتہ کشمیر میں کچھ ایسے مناظر بھی ہیں جو کشمیر میں اسلام کی آمد خاصکر فارسی زبان وادب کے زمانے میں کشمیر میں مقیم کشمیر کے حکمرانوں، گورنروں، صوبیداروں، ناظموں اور لوگوں کے تعمیر کردہ ہیں جو کشمیر کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتے ہیں۔ کشمیر میں مغلوں کی رسائی ہونے کے بعد مغلوں نے ایسے بیشمار کارنامے انجام دیئے جو آج بھی سینکڑوں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور ان کارناموں کی وجہ سے مغلوں کا نام آج بھی زندہ ہے۔ کشمیر کی تہذیب وتمدن کی بہتری کے لئے مغلوں سے قبل فارسی زبان وادب کے چاہنے والوں میں میر سیّد علی ہمدانی کے علاوہ، ایران وترکستان سے آئے ہوئے میر سید علی ہمدانی کے ہمراہ لوگوں نے اس کی بنیاد رکھ دی تھی۔ کشمیر میں مغلوں سے پہلے بھی ایسے کارنامے وجود میں آئے جنھوں نے کشمیر کی تہذیب وتمدن کو چار چاند لگائے۔ مثال کے بطور کچھ درج کئے جاتے ہیں۔

سلطان سکندر کشمیر کا ایک اچھا بادشاہ گذرا ہے۔ عوام کے ساتھ اچھا سلوک وبرتاؤ کرنے کی وجہ سے لوگوں میں کافی مشہور بادشاہ گذرا ہے۔ انہی اپنی اچھائیوں کے سبب اس کی وفات پر مرثیہ بھی لکھا گیا۔ سلطان سکندر نے خانقاہ میر سیّد علی ہمدانی کو تعمیر کراویا۔ اسی طرح بڈشاہ کے دورہ حکومت میں شال بافی اور چوبکاری (Wood Carving) کو کافی اہمیت دی گئی۔ اس طرح دیگر کئی کام مغلوں سے پہلے کشمیر میں انجام دیئے گئے جو کشمیر کی تہذیب وتمدن کے لئے ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مغل دور میں کشمیر میں پہنچنے کے لئے مشکل راستوں سے گذر کر جانا پڑتا تھا جس کا ذکر ہمیں کئی شاعروں کی شاعری میں ملتا ہے ظفر خان احسن اپنی مثنوی جلوہ ناز میں کشمیر کے مشکل راستوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

دراین رہ بر سر کوہی گذارست کہ آنجا تافلک یک نعرہ وار است
شکستہ رنگ روی خون آراست کہ رفتن تا سر کوہش گرانست
ببالایش رسیدن ہست مشکل درین رہ سر صد جا کردہ منزل
بہم پیچیدہ میگردد چو مکتوب درین راہ عمر خضر و صبر ایواب ۔۲

ظفر خان احسن نے شاہجان بادشاہ کے دور حکومت میں کشمیر میں صوبیداری کے فرائض انجام دیئے۔ شاہجان سے قبل جہانگیر اور اکبر بادشاہ کا دور گذرا ہے اکبر کے ہمراہ کشمیر کے سفر میں بھی

شعراء موجود تھے البتہ فیضی فیاضی نے بھی کشمیر کے مشکل راستوں کا ذکر اپنے قصیدے میں کیا ہے لیکن فیضی یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس بادشاہ کے حکم سے پہاڑوں کو چیر کر دودھ جیسی ندیاں جاری کی گئی اوران بڑے بڑے پہاڑوں کواس طرح تراشا گیا کہ شہسوار کے لئے گزرگاہیں بن گئی۔ان چشموں اوردریاؤں کودیکھو جواس کے حکم سے پہاڑوں کوتوڑ کر بنائے گئے ہیں۔

بہ حکم خسروواالاز تیشہ کوہ کنان　　ھزارجوی روان کردہ صاف پرازشیر
بہ چشمہ چشمہ نظرکن بہ سیل سیل ببین　　مگر گرانی او کردہ کوہ راتعصیر

فیضی لکھتے ہیں کہ کشمیر پہنچنے کے لئے مشکل راستوں سے گزرنا پڑا یہ ایسے راستے ہیں جو آسمان سے گذرتے ہیں لیکن جب راستے بنائے گئے تورعایا اکبر بادشاہ کی حکومت کے نغمے گانے لگی۔

زمین عرصہ کشمیرزآسمان گذراندم　　بفردولت تقبیل پایہ ھای سریر ۔۳

اکبر بادشاہ نے کشمیر میں کئی کارنامے انجام دیئے مغل دور میں کشمیر میں رسائی حاصل کرنے لئے لاہور سے گذرکر جاتے تھے جس کی مثال میں ہمیں کئی قلعے اورسرائیں دیکھنے کوملتی ہیں جو اس بات کی گواہی ہے کہ مغل دور میں سفر کے دوران رات میں ٹھرنے کے لئے مغلوں نے بنوائی تھی۔ جموں صوبہ کے ضلع راجوری میں ۔چنگس ۔کے مقام صدیوں بعد ایک قلع آج بھی موجود ہے جس کے بارے میں یہ لکھا جاتا ہے کہ مغل حکمران اس قلع میں سفر کے دوران ٹھرتے تھے۔اسی طرح صوبہ جموں کے ضلع پونچھ میں موجود نوری چھم کے نام سے ایک مشہور جھرنا مغل بادشاہ جہانگیر کی ملکہ نور جہان کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔آج ضلع پونچھ سے کشمیر میں جانے والی سڑک بھی مغل روڈ کے نام سے مشہور ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں مغل حکمران اس راستے سے کشمیر جاتے تھے جس وجہ سے موجودہ دور میں اس سڑک کا نام مغل روڈ پڑا ہے۔اسی مغل روڈ بمقام پیرگلی سے کچھ کلومیٹر دورایک سرائ موجود ہے جواس بات کی گواہی ہے کہ واقعاً مغل دور کے حکمران انہی راستوں سے گزرکر کشمیر جاتے ہیں۔

کشمیر میں موجود نسیم باغ، کشمیر کے قدیم باغوں میں سے ایک ہے۔نسیم باغ مغل بادشاہ اکبر کے حکم سے بنوایا گیا تھا اورشاہجان بادشاہ نے اس باغ میں چنار کے پودے لگوائے تھے یہ باغ کشمیر یونیورسٹی حضرت بل کے نزدیک واقع ہے۔اسی طرح ہری پربت قلع جس کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ یہ قلع افغان گورنرعطا محمد خان نے مکمل کیا تھا لیکن اس کی ساخت و بنیاد مغل بادشاہ اکبر نے ۱۵۹۰ میں رکھی تھی۔کشمیر میں مغلوں نے کئی کارنامے انجام دیئے ان میں سے کئی زمانے کے

اُتار و چڑھاؤ کی وجہ سے ختم ہو گئے اور کافی تعداد میں موجود بھی ہیں۔نشاط باغ کی بات کی جائے تو نشاط باغ کشمیر میں موجود مشہور جھیل 'ڈل جھیل' کے مشرق میں واقع ہے یہ باغ ملکہ نور جہان کے بھائی آصف خان نے بنوایا تھا۔نسیم باغ اور نشاط باغ کی تعریف کرتے ہوئے کشمیر کے مشہور شاعر فانی لکھتے ہیں۔

اگر کس کند سیر باغ نسیم نیارد دگر یاد باغ نعیم
اگر سر کنم وصف باغ نشاط ن گنجد دلم در تن از انبساط
ز جوش گل و لالہ این دو باغ شدہ گلشن خلد و فردوس باغ ۔۴

اسی طرح شالیمار باغ بادشاہ جہانگیر نے ڈل جھیل کے شمال مشرق میں بنوایا۔نشاط باغ و شالیمار باغ آج بھی روزانہ ہزاروں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں باغ نشاط کا ذکر کرتے ہوئے ظفر خان احسن لکھتے ہیں۔

بود در پای ہر گل چشمہ ساری روان چون اشک بلبل بیقراری
یکی نہر از میان او روانست کہ فوارہ بہ مدحش تر از زبانست ۔۵

ان باغوں کے لئے ہی نہیں ظفر خان نسیم باغ کے لئے بھی لکھتے ہیں نسیم باغ مجھے کابل کے باغوں کی یاد دلاتا ہے۔

**چشمہ شاہی:**(Royal Spring) بھی کشمیر میں مغلوں کا تعمیر کردہ ہے۔چشمہ شاہی شاہجان بادشاہ کے گورنر علی مردان خان نے تعمیر کیا تھا۔چشمہ شاہی کا ذکر کرتے ہوئے Moore Charles Willard اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

*"Chashma Shahi(Royal Spring) was built to the south of Nishat , perched high on a mountainside overlooking the lake by shah jahan;s Governer Ali Mardan Khan . It is much more intimate in scale than either Shalamar or Nishat little more.Infact Then a terrace for court to the bardari housing of spring and its glory is one great Chadar running down its Central axis"6*

چشمہ شاہی کے علاوہ 'اچھا بل' باغ صوبہ کشمیر کے ضلع اننت ناگ میں واقع ہے یہ باغ

مغل بادشاہ جہانگیر کی بیوی نور جہان نے بنوایا تھا۔اسی طرح چشمہ ویرناگ، جب شاہجان بادشاہ تیسری مرتبہ لاہور سے کشمیر کے سفر پر روانہ ہوا۔اس سفر میں بادشاہ نے چشمہ ویرناگ کی مرمت کرنے کا حکم دیا اور چشمہ پر منبع ایک آبشار تعمیر کروایا۔اس مقام پر پتھر پر ایک تاریخ تحریر ہے 'از چشمہ بہشت برون آمداست'۔

شاہجان بادشاہ کے دورہ حکومت میں صوبیداری کے فرائض انجام دینے والوں میں ظفر خان احسن بھی موجود تھا۔کشمیر کی عوام کے ساتھ ظفر خان احسن کا اچھا سلوک اور رویہ تھا جس سے کشمیر کی عوام ظفر خان سے بہت خوش تھی ۔ظفر خان احسن نے کشمیر میں کئی کام انجام دیئے ۔کشمیر میں بنوائے ہوئے خود کے باغوں کا ذکر کرتے ہوئے ظفر خان احسن لکھتا ہے۔

بنا کردم درین عشرتسر امن　　شگفتہ ہمچو طبعم چار گلشن
حسن آباد از آنہا ہست ممتاز　　گلشن در دلربائ شوخ و طنار

حسن آباد میں خود کے بنوائے ہوئے قصر کا ذکر بھی شاعر نے جلوہ ناز میں کیا ہے کہ اس خوبصورت پر فیض اور عیش وعشرت بخشنے والی جگہ میں نے ایک خوبصورت، دل افروز محل تعمیر کروایا۔

درین پر فیض جای عشرت اندوز　　بنا کردم یکی قصر دل افروز ۔ے

ظفر خان احسن کے علاوہ دیگر صوبیداروں یا گورنروں نے بھی کشمیر میں اپنی بہترین خدمات انجام دیں ان میں سیف خان، افتخار خان اور فاضل خان کے نام ناقابل فراموش ہیں ۔ سیف خان عہد اورنگ زیب میں کشمیر میں صوبیداری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔سیف خان کے دور میں کشمیر میں زلزلہ ہونے کی وجہ سے شہر تباہ ہو گیا۔سیف خان نے اس موقع پر ایک نیا شہر 'محمود آباد' کے نام سے تعمیر کروایا۔سیف خان نے صفا کدل کے مقام پر دریائے جہلم پر بنے پل کو مضبوط اور وسیع کروایا۔اس کے علاوہ سیف خان نے ڈل کے کنارے 'سیف آباد باغ' بھی بنوایا جس کا ذکر اے۔ہسٹری۔آف۔مسلم رولرز این کشمیر میں یوں ہے۔

*"Saif Khan was a Noble Builder .He laid out the Garden of Saif-abad on the Bank of Dal lake" 8*

افتخار خان کشمیر میں صوبیداری کے فرائض انجام دے رہے تھے ۔افتخار خان کے دورہ حکومت میں آگ کی زد میں جامع مسجد کے علاوہ کئی گھر بھی آ کر راکھ ہو گئے ۔افتخار خان نے اپنی ذاتی دلچسپی سے جامع مسجد کو از سر نو تعمیر کراوایا۔افتخار خان کے علاوہ فاضل خان نے بھی کشمیر میں صوبیداری

کے فرائض انجام دیئے۔اس کے دورہ حکومت میں موی مبارک رسول ﷺ بھی کشمیر لائے گئے ۔فاضل خان کو تعمیرات سے کافی دلچسپی تھی تاریخ حسن جلد دوم میں فاضل خان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''وسد ہفت چنار وسرای آنجا و خانقاہ حسن آباد و خانقاہ جوگی لنکر و مدرسہ وحمام متصل نو مسجد سنگین از تعمیرات اوست''۔۹

بالآخر یہ کہ فارسی زبان کے دانشوران نے کشمیر میں کئی کارنامے انجام دیئے جو آج بھی کشمیر کی تہذیب وتمدن کی زینت بنے ہوئے ہیں۔اس مقالے میں ہر ایک چیز کا ذکر کرنا ناممکن ہے البتہ اس مقالے میں ایک چھوٹی سی کوشش کی گئی ہے۔فارسی زبان وادب کے چاہنے والوں کو تعمیرات سے خاصی دلچسپی تھی۔مغل دور میں اگر شاہجان بادشاہ کو دیکھا جائے تو صرف شاہجان بادشاہ کے دور حکومت میں لال قلع، جامع مسجد، تاج محل کے علاوہ دیگر چیزیں آج بھی مغل حکمرانوں کا نام زندہ رکھی ہوئی ہیں۔کشمیر میں بھی مغلوں نے کئی چیزیں بن گئی ان میں کافی زمانے کے اُتار وچڑھاؤ کی وجہ سے یا توجہ کا مرکز نہ بننے سے، آج صرف ان کے نام باقی ہیں لیکن بہت بڑی تعداد میں مغلوں کا سرمایہ کشمیر میں موجود اور نمایان نظر دکھائی دیتا ہے۔قالین بافی کا رواج آج بھی کشمیر میں موجود ہے اچھی تعداد میں لوگ اس شعبے سے جڑے ہوئے ہیں اور بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ قسم کی قالینیں تیار کر کے انہیں اپنی آمدنی کا ذریعہ بناتے ہیں۔حال ہی میں ایشا کی سب سے بڑی قالیں کشمیر میں تیار کی گئی ہے جس کا ذکر مختلف سوشل میڈیا پلیٹفارم پر بھی ہوا ہے۔میر سیّد علی ہمدانی کے ہمراہ آئے ہوئے ماہرین نے کشمیر کے لوگوں کو جن ہنروں سے آشنا کروایا تھا اس کا رواج آج بھی کشمیر میں باقی ہے۔ اسی طرح کشمیر میں چوبکاری کاری کا رواج آج بھی برقرار ہے اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس فن سے جڑی ہوئی ہے۔چوبکار عمدہ اور اعلیٰ پایہ کی چوبکاری کرتے ہیں جس کا اثر ہمیں آج کشمیر میں موجود لوگوں کے گھروں میں دیکھنے کا ملتا ہے۔کشمیر کے گھروں کے علاوہ کشمیر میں موجود صوفیا کے مزارات وغیرہ پر بھی عمدہ چوبکاری نظر آتی ہے۔اسی طرح باغات کے چاہنے والوں میں کشمیر میں موجود اکثر وبیشتر لوگ موجود ہیں جو باغبانی سے جڑے ہوئے ہیں۔یہ لوگ عمدہ اور اعلیٰ پایہ کے پھل تیار کر کے انہی کو اپنی آمدنی کا سبب بناتے ہیں۔مغل دور کے باغوں کی بات کریں تو وہ باغات کشمیر کی خوبصورتی کو بڑھانے کے لئے بنائے گئے تھے جس کی مثال ہمیں آج بھی اُن باغات میں موجود پھولوں سے ہوتی ہے لیکن ظفر خان احسن اپنی مثنوی جلوہ ناز میں لکھتے ہیں وہاں کے باغوں میں طرح طرح کے پھل موجود ہیں۔مغل دور میں کشمیر میں بنائے ہوئے باغات آج بھی Tourism

(Department of Jammu and Kashmir) کی نگرانی میں سرکاری آمدنی بڑھاتے ہیں۔شاید انہیں باغات سے متاثر ہوکر کشمیر کے لوگوں نے پھلوں کے باغات کو ایسی ترویج دی کہ کشمیر میں موجود پھل دنیا میں مشہور اور معروف ہیں اسی طرح شال بافی کا رواج آج بھی کشمیر میں موجود ہے اور آج بھی کشمیر کی شال کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔خوشنویسی کا رواج بھی کشمیر میں موجود ہے جس کی مثال ہمیں صوفیا کے مزارات کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔فارسی زبان وادب کے شعر بھی ہمیں بعض صوفیا کے مزارات پر لکھے ہوئے نظر آتے ہیں یہ کہنا غلط نہ ہوگا ان سب چیزوں کی شروعات فارسی زبان وادب کے چاہنے والوں کے توسط سے ہوئی تھی لیکن کشمیر کے لوگوں نے انہیں اپنا کر اس کا رواج برقرار رکھا اور آج بھی ان میں اکثر چیزیں بعض لوگوں کی آمدنی کا حصہ ہیں۔

**حولاجات:**


۱: علامہ اقبال۔جاوید نامہ،صفحہ نمبر ۱۸۵،ڈاکٹر وحید قریشی اقبال اکادمی پاکستان لاہور۔۱۹۸۲ء

۲: ظفر خان احسن،مثنوی جلوہ ناز،فولیو نمبر ۴۳،نسخہ خطی شمارہ نمبر ۳۱۰،روئیل ایشاٹک سوسائیٹی لندن

۳: فیضی فیاضی قصیدا ''درتوصیف کشمیر وتہنیت فتح آن ومدح اکبر بادشاہ''۔

۴: پروفیسر عراق رضا زیدی،مثنویات فانی کشمیری کا تنقیدی جائزہ،ص نمبر ۱۸۸۔

۵: ظفر خان احسن،مثنوی جلوہ ناز،فولیو نمبر ۵۶،نسخہ خطی شمارہ نمبر ۳۱۰،روئیل ایشاٹک سوسائیٹی لندن۔

۶: The Poetic Gardens by Moore-Charles willard 1925,Page 167,Cambridge,Mass MIT press London 1988

۷: ظفر خان احسن،مثنوی جلوہ ناز،فولیو نمبر ۵۸،نسخہ خطی شمارہ نمبر ۳۱۰،روئیل ایشاٹک سوسائیٹی لندن۔

۸: A History of Muslims Ruler in Kashmir by: Dr.R.K.Parmu,Page no 324 ,People Publishing house Delhi,1969.

۹: پیر غلام حسن کہویہامی،تاریخ حسن جلد دوم،ص نمبر ۵۱۹،محکمہ تحقیق واشاعت حکومت جموں وکشمیر


☆☆☆

Ghair Muslim Naat Go Shoara by Ajaz Ahmad Dar (Research Scholar
Dept. Of Urdu Kashmir University (Srinagar)
**اعجاز احمد ڈار** (ریسرچ اسکالر مرکزی جامعہ کشمیر، سرینگر)

# غیر مسلم نعت گو شعرا

نعت پوری دنیا میں ایک ایسی لازوال صنف ہے جو ۱۴۰۰ سالوں سے روحوں کو سیراب کرتی رہی ہے اور جب تک کائنات قائم و دائم ہے تب تک اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ زمانہ بدلتا رہا، سائنس ترقی کرتی رہی، ٹیکنالوجی نت نئی دنیا دکھاتی رہی، انسان اپنی کمندیں آسمان میں ڈالتا رہا، لیکن نعت کا قوی اور مصدقہ جذبہ انسان کو اس طبعیات کی محدود دنیا میں سرور قلب اور اطمینان روح فراہم کرتا رہا۔ جدیدیت نے جہاں انسان کو ذہنی انتشار و خلفشار اور قلبی اضطراب کا شکار بنا دیا وہیں نعتیہ شاعری مردہ دلوں کو زیست، روح کو تسکین اور ذہن کو فرحت فراہم کرتی رہی ہے۔ بے شک سائنس اور ٹیکنالوجی نے جس برق رفتاری سے انسانی زندگی کو آسان سے آسان تر بنا دیا ہے، لیکن اسی تیز رفتاری سے انسان کو انسانیت سے محروم کر کے اسے مشین بھی بنا دیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اسی دور میں نعتیہ شاعری ایک موثر آلہ ہے جو روحوں کو غذا فراہم کر کے انسان کو تطہیر نفس سے قریب تر کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک طرف سائنسی شعور رکھنے والا انسان نت نئی کھوج کا جذبہ اور تجسس رکھتا ہے وہیں ایمانی شعور والا شاعر عشق رسول ﷺ میں مستغرق ہو کر نعتیہ شاعری کو اپنے خون جگر سے پروان چڑھا کر اس کی لو آسمان کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔ نعتیہ شاعری کا یہ جذبہ متبعین رسول ﷺ تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ کئی غیر مسلموں نے بھی اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا دیا ہے۔ جنہوں نے آپ ﷺ کی عظیم المرتبت شخصیت سے مضبوط اور گہرا شغف دکھا کر اس صنف میں اپنی عقیدت مندی کی مہر ثبت کر دی ہے۔

اسلامی ادب میں نعتیہ شاعری کی قدر و منزلت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ کی مدح سرائی کا آغاز آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی ہوا ہے۔ لیکن آپ ﷺ کی بعثت کے بعد یہ اسلامی ادب کا ایک لازوال باب کی حیثیت قائم کرنے لگا۔ اگر نعت لکھنے والوں میں حضرات صحابہ

کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سرفہرست ہیں تو وہیں آپ ﷺ کے مخالفین بھی آپ ﷺ کی مدحت سرائی کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ جو کوئی انسان دل میں کج روی اور قلبی کدورت کو ترک کر کے آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کا مطالعہ کرے وہ آپ ﷺ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے خواہ وہ ہندو ہو عیسائی ہو سکھ یا کسی اور مذہب سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس کی ایک زندہ مثال مائیکل ایچ ہارٹ ہے جس نے the hundred کتاب لکھی اور اس میں اس نے حضرت محمد ﷺ کو پہلا مقام دیا ہے۔ یہ آپ ﷺ کی سیرت وصورت کا ہی کمال ہے کہ مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں نے بھی عقیدت واحترام کا اظہار کرتے ہوئے آپ ﷺ کی سیرت اور نعت کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔

نعت لکھنے کا آغاز حضرت محمد ﷺ کی حیات مبارکہ میں ہی شروع ہو گیا تھا اور اس ضمن میں صحابۂ کرام کی ایک لمبی قطار نظر آتی ہے، جنہوں نے حضرت محمد ﷺ کے عادات واطوار، اخلاق و کردار، رہن سہن، سیرت وصورت کو موضوع بنایا ہے۔ ایسے صحابیوں میں حسان بن ثابتؓ، اسود بن سریعؓ، عباسؓ بن عبدالمطلب، کعبؓ بن عزیر، عبداللہؓ بن رواحہ قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح اردو میں بھی نعتیہ اشعار کہنے والوں کی ایک کھیپ نظر آتی ہے جن میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، نصرتی، نشاطی، غواصی، طبعی، میراں جی، حسرت، اختر شیرانی، حالی، اقبال، امیر مینائی، ظفر علی خان، محسن کاکوروی، ماہر القادری اور دور حاضر میں علیم صبا نویدی، نادم بلخی، نعیم صدیقی، عامر عثمانی، دانش فرازی، مشاہد رضوی، مناظر عاشق ہرگانوی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو شاعری میں نعتیہ کلام کے میزان ومعیار پر جب ہم تحقیقات کرتے ہیں تو اس ضمن میں مسلم نعت گو شعراء کے شانہ بشانہ ہمیں غیر مسلم نعت گو شعرا بھی نظر آتے ہیں اور جب ہم ان کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کے عقیدت واحترام سے لبریز نعتیہ اشعار کسی بھی انداز میں مسلم شعراء کے کلام سے کم تر محسوس نہیں لگتے ہیں۔ مقدار اور معیار ہر اعتبار سے سرمائے اردو نعت میں بیش بہا اضافہ کرتے ہوئے غیر مسلم شعراء کے حوالے سے جو تحقیق کی گئی ہے وہ اردو ادب کی رو سے ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ نور محمد میرٹھی کی کتاب "بہر زماں بہر زباں" ایک بہترین کتاب ہے جس میں تین سو سے زائد غیر مسلم شعراء کی نعت گوئی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ غیر مسلم نعت گو شعر نے اس صنف میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

نعتیہ شاعری اردو کی ایک باضابطہ صنف رہی ہے اور جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو

اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک موضوعی صنف ہے جس کے لیے غزل، نظم میں مثلث، مخمس اور مسدس سمیت اردو کی رائج کوئی بھی ہیئت استعمال کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک مقدس صنف ہے جس کا موضوع دنیا و مافیہا کی وہ عظیم ترین شخصیت ہے جس کے ثناخواں خود اللہ عزوجل ہے۔ لہٰذا اس فن میں طبع آزمائی کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے اس نازک فن کے متعلق اسلم بدر رقم طراز ہیں۔

''نعتیہ شعر کہنے کے لیے نہ صرف فنی شاعری سے بلکہ ذات وصفات محمدی سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ ذات وصفات محمدی کو سمجھ کر اس کا ذکر اس طرح کرنا کہ آپ ﷺ کی ذات بابرکات کا اوپری سرا الوہیت کو نہ چھونے لگے اور نچلا سرا تنقیص کی حد تک نہ پہنچ جائے، نعتیہ شاعری کی حدیں متعین کرتا ہے۔ اور انہیں حدوں کو ''تلوار کی دھار'' یا 'پل صراط'' کہا گیا۔[۱]

غیر مسلم نعت گو شعرا کے کلام میں پاکیزہ جذبات کی حدت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا پیرائے اظہار، اسلوب اور صاف شگفتہ الفاظ کا چناؤ اس امر پر انسان کو ابھارتا ہے کہ انہیں غیر مسلم کہنے کو دل نہیں چاہتا ہے۔ یہ ان کے مطالعہ اسلامی تاریخ وتہذیب اور آپ ﷺ کی سیرت کے ساتھ والہانہ عقیدت وتوقیر پر دلالت کرتا ہے۔ اگر آپ ﷺ کے صحابہ نے سب سے پہلے اپنے پاکیزہ جذبات وعقیدت کو نعت کی صورت میں نظم کیا ہے مگر اردو شاعری میں صحابہ کے دور سے لے کر آج تک کہ ہر دور میں غیر مسلموں کی اچھی خاصی تعداد اس صنف کی طرح التفات کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ انھوں نے اس سنت کو محض رسمی طور پر نہیں برتا ہے بلکہ آپ ﷺ کی سیرت انسانیت عدل وانصاف کو دیکھ کر معیار اور مقدار کے اعتبار سے نعتیں لکھی ہے ان کے کلام خلوص احترام اور سیرت واقفیت کی خوبصورت پرتی واہ ہو جاتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف اس صرف کو برتا بلکہ ہندی شاعری کے استعارے بھی نہ تو میں برت کر اردو زبان کو نیا رنگ وآہنگ بخشا ہے۔ ان کے کلام میں جذبات کی وہ تمازت محسوس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شعور اور سلیقہ اظہار بھی نظر آتا ہے جو صرف نعت کے لیے مخصوص ہے۔ غرض غیر مسلموں نے مسلمانوں سے کم تر اسلوب یا مواد کے اعتبار سے نعت نہیں لکھی ہے یہ ان کے اس فن پر اور آپ ﷺ کی سیرت پر کامل واکمل دسترس اور شغف کی غمازی کرتا ہے۔

ہندوستان ایک کثیر اللسان اور کثیر التہذیب ملک ہے، یہاں رواداری، بھائی چارہ، محبت واخوت لوگوں کی سرشت میں شامل ہیں۔ غیر مسلم نعت گو شعرا نے جو نعت کی طرف اپنی عقیدت و احترام کا عملی ثبوت دیا ہے اس کے بہت سارے سیاسی ومعاشرتی محرکات کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم کے درمیان آپسی رواداری اور جنگ آزادی کی ملی جدوجہد بھی کارفرما تھی۔ اس صورت حال کی بھرپور

عکاسی نور احمد میرٹھی اپنی کتاب میں ڈاکٹر ریاض مجید کے حوالے سے ان آب زر سے لکھے جانے والے الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ہندو شاعروں کی نعت گوئی کا حقیقی دور ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد ہوا ہے۔عصر جدید میں ہمیں متعدد ایسے غیر مسلم شاعر ملتے ہیں جنہوں نے مقدار اور معیار، ہر اعتبار سے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔اس کے بہت سے سیاسی و معاشرتی عوامل ہیں۔ایک بڑی وجہ وہ رواداری کی فضا ہے جو جنگ آزادی کے بعد ہندو مسلم قوموں میں پہلے کی نسبت کچھ نمایاں ہوگئی تھی۔۔۔مخلوط معاشرے میں اگرچہ مسلم ہندو تعلقات میں ایک کشیدگی ہمیشہ رہی اور دونوں قوموں کے تہذیب و تمدن میں واضح اختلاف رہا، اس کے باوجود اہل فکر و قلم کے حلقوں میں ایک رواداری کی فضا ملتی ہے۔جدید علوم اور برصغیر کے بدلتی ہوئی معاشرت میں مذہبی عصبیتوں کا جوش اور شدت ذرا کم پڑی تو اس رواداری میں اضافہ ہوا۔علامہ اقبال کی نیا شوالہ، نانک، رام، سوامی تیرتھ پر لکھی ہوئی نظمیں اس رواداری کی علامت ہیں۔۔۔رواداری اور یگانگت کے اسی جذبہ کے فروغ کے لیے بعض ادبی و سیاسی، مذہبی و ثقافتی اجتماعت میں ایک دوسرے کے مشاہیر کو خراج عقیدت پیش کرنے کا رواج ہوا۔ہندو شاعروں کے ہاں نعت گوئی کے ذوق کو اسی ماحول میں جلا ملی۔ان معاشرتی و سیاسی عوامل میں سب سے بڑی کر رحمت للعالمیں صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے جن کی سیرت و کردار اور پیغام نے اہل فکر لوگوں کو خاص طور پر متاثر کیا اور انہوں نے اپنے تاثرات کو قلمبند کر کے اس روایت کو مستحکم کیا۔''۲؎

چاہے محرکات و عوامل کچھ بھی ہوں آپ ﷺ کی شخصیت سے ابتدائے وقت سے ہی باشعور اور باذوق طبقہ بالخصوص شعرا حضرات متاثر رہے ہیں اور انہوں نے آپ ﷺ کے تئیں اپنے پاکیزہ جذبات کو لفظی پیراہن پہنا کر نعتیہ اشعار میں پرویا ہے۔اس ضمن میں ذیل میں کچھ مشہور غیر مسلم نعت گو شعرا کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

**ہری چند اختر**: پنڈت ہری چند اختر کا شمار اردو کے موقر اور مایہ ناز شعرا میں ہوتا ہے۔پانی پت سے تعلق رکھنے والے فارسی اور انگریزی زبان پر کامل دسترس رکھتے ہوئے ہری چند اختر نے دیگر غیر مسلم شعرا کی طرح نعت گوئی کی طرف ارادی طور التفات کیا ہے۔ان کی نعتیں وفور جذبات کی صداقت سے مملو ہو کر منصۂ شہود پر آئیں اور اس طرح آسمان نعت گوئی پر درخشندہ ستارے کی مثل چمکنے لگے۔انہوں نے آپ ﷺ کے اوصاف حمیدہ کو بڑے فنکارانہ اور والہانہ عقیدت و توقیر کے ساتھ برتا ہے۔الفاظ کا پر کیف استعمال کر کے آپ ﷺ کے گوناگوں خصائص کو نعت کے قالب

میں اس طرح پرویا ہے۔

کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا — کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا
شوکت مغرور کا کس نے توڑا طلسم — منہدم کس نے الٰہی قصر کسریٰ کر دیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دریتیم — اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا
زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر — اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا — اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

**گرسن لال ادیب لکھنوی:** گرسن لال نام اور ادیب لکھنوی تخلص غوث نگر لکھنو میں پیدا ہوئے ہیں۔ میلاد نامے اور دیگر مذہبی محافل کے ساتھ بچپن سے ہی خاص شغف رکھتے تھے۔ جب شعری ذوق پروان چڑھنے لگا تو کئی مجموعے جیسے ''چھلکتے جام، چھوٹے نانک، رباعیات ادیب، زندان سے گلشن تک'' اور آپ ﷺ کی مدحت میں ''نذرانہ عقیدت'' زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ گئے۔ آپ کا نعتیہ کلام آپ ﷺ کے ساتھ بے پناہ محبت، خلوص، دیانت داری اور متاثر ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ ایک ایک لفظ آپ ﷺ کی محبت میں شرشار نظر آتا ہے، جس نے آپ کے قلبی و ذہنی صداقت کے ساتھ ساتھ آپ کی نعت گوئی کو ایک ایسا معزز اور اتنا پاکیزہ بنا دیا کہ رتی برابر بھی یہ محسوس نہیں ہوتا ہے کہ یہ کسی غیر مسلم کا نذرانہ عقیدت ہوگا۔ یہ آپ کا کمال فن ہے۔ آپ ﷺ کو مختلف القابات جیسے فخر آدم، عرب و عجم کا اوتار، سرچشمہ حق و صداقت، معجزۂ ہادئ برحق، خاتم النبیین سے یاد کرتے کرتے آپ ﷺ کے اوصاف حمیدہ کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم، بھائی چارہ، دعوت توحید اور مدینہ کی تعریف و تقدیس کو سلاست و روانی کے ساتھ نعتیہ اشعار میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو چند اشعار جو تار رباب نظر آتے ہیں۔

آؤ ہم سب مل کے بیٹھیں پیار کی باتیں کریں — کچھ عرب میں پریم کے اوتار کی باتیں کریں
فخر آدم احمد مختار کی باتیں کریں — دو جہاں کے سرور سردار کی باتیں کریں
پریم کی گنگا بہائی جس نے ریگستان میں — روح تازہ پھونک دی مٹتے ہوئے ایمان میں
انبیا کی برتری کا تھا شرف جن کو نصیب — وہ خدا کے پاک و برتر نے کیا جس کو حبیب
لڑکیوں کا قتل کر دینا بھی تھی اک رسم عام — خاندانوں میں کیا جاتا تھا صدیوں انتقام
میرے سر آنکھوں پہ فرمان رسول عربی — جان و دل دونوں ہی قربان رسول عربی
مسلموں تک ہی نہیں فیض رسالت محدود — عام ہے خلق پر احسان رسول عربی

السلام اے رہبر دنیا و دین السلام اے رحمۃ اللعالمین
تیرا نقش پا چراغ حق نما ہر سخن تفسیر قرآن مبیں

**دیا شنکر بحر موجی:** اصل نام دیا شنکر اور تخلص بحر موجی ضلع ایٹہ اتر پردیش میں ۱۹۱۱ کو پیدا ہوئے ہے۔بیس سال کی عمر میں شاعری کی طرف میلان بڑھ گیا اور موج صدیقی کو اپنا استاد بنا کر باقاعدہ طور پر شاعری کا آغاز کیا۔دیگر اصناف شعری میں اپنے قلبی واردات کو بیان کرتے کرئے آپ ﷺ کی ذات اقدس سے بھی غیر معمولی عقیدت کے اظہار کرنے سے اپنے قلم کو مزید جلا بخشی ہے اور رہتی دنیا تک اپنے قلم کو حیات جاودان بنا دیا ہے۔ان کا کلام آپ ﷺ کے ساتھ والہانہ عقیدت و توقیر کا بین ثبوت ہے۔آپ ﷺ کے تئیں محبت کو اصل دولت سے تعبیر کرتے ہوئے اپنے آپ کو باسعادت تصور کرتے ہیں۔آپ ﷺ کے علم،حکمت،فراست اور سخاوت کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔پیش ہیں کچھ اشعار۔

رسول خدا کی محبت ملی ہے مجھے دونوں عالم کی دولت ملی ہے
جو مومن ہیں سایہ فگن ان کے سر پر خدائے دو عالم کی رحمت ملی ہے
دلدادہ ہوں میں ہاشمی و مطلبی کا دیوانہ ہوں میں دل سے نبی عربی کا
یہ علم،یہ حکمت،یہ فراست،یہ سخاوت شہرہ ہے جہاں میں شہ اس نبی کا
جس نے ہمیں توحید کے اسرار بتائے اے بحر میں قائل نہ ہوں کیوں ایسے نبی کا

**منور لکھنوی:** نام بشیشور پرشاد،تخلص منور لکھنوی ۱۸۹۷ کو لکھنو میں پیدا ہوئے ہیں۔اسلامی ادب کے ساتھ بے پناہ خلوص کے تئیں قرآن کے بعض حصوں کا منظوم ترجمے کیا ہے اور اپنے مصدوق خلوص و احترام کا اظہار نعتوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔آپ ﷺ کی شان اقدس کو اپنے شعری انداز میں پیش کر کے اپنے آپ کو مدحت رسول ﷺ کی صف میں شامل کر دیا ہے۔آپ حضورؐ کو داعئ اسلام کہہ کر کبھی شان عرب کہتے ہیں تو کبھی نور وحدت سے بیابان عرب کو چمکانے والے خورشید تابان کے القاب سے نوازتے ہیں۔آپ کی نعتوں کی گیرائی و گہرائی سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ آپ پیغمبر کریم ﷺ کی شان،عظمت و رفعت،خاتم النبیین،صاحب قرآن،اسلام کی صداقت اور نظام،شریعت کے مزاج اور مزاج دین اسلام سے بہرہ ور تھے اور جس سے اسلامی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ان کی گہری نظر کی پرتیں وا ہوجاتی ہے۔پیش ہے نمونہ کلام۔

جس کا بانی آپ سا ہادی ہے یہ وہ دین ہے اس کی پابندی نہ کرنا آپ ﷺ کی توہین ہے

بانی اسلام اے خورشید تابان عرب — اے محمد مصطفی ﷺ جان عرب، شان عرب
آپ پر نازل خدائے پاک نے قرآن کیا — سرمۂ توحید سیوار یدۂ عرفان کیا
ناشناہی راز پنہاں حق و باطل ہوں میں — کیسے پھر اسلام کی تفہیم کے قائل ہوں میں
گو مسلمان ہی نہیں پر قائل اسلام ہوں — کہوں کہ مردان خدا کا بندہ بیدام ہوں

**راجندر بہادر:** اصل نام راجندر بہادر، تخلص موج فتح گڑھی ۱۹۲۲ میں اتر پردیش میں پیدا ہوئے ہیں۔ ۱۹۳۹ میں مستقل طور پر شاعری کی طرف رخ کیا اور پھر کئی شعری مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ گئے۔ ''موج ساحل، موج در موج، ساگر، موجیں، لہریں، آکاش'' وغیرہ شعری مجموعے مشہور ہیں۔ اپنے شعری ذوق و وجدان کو متبرک اور منوّر آپ ﷺ کی شان میں مدحت سرائی سے بنا دیا۔ آپ ﷺ کو پوری دنیا کے لیے رحمت کے طور پر مبعوث فرمانے پر یقین محکم رکھتے ہوئے آپ ﷺ کو شمع ہدایت، اول و آخر، اپنے حال و احوال سے باخبر جیسے اوصاف اور القابات کا عقیدہ رکھتے ہیں اور آپ ﷺ کے سہارے کو ہی اپنے لیے واحد اور پائیدار سہارا تصور کرتے ہیں، ان کا نمونہ کلام اس طرح ہیں۔

نور ہی نور ہے تا عرش بریں آج کی رات — راستے تکتے ہیں جبرائیل امین آج کی رات
ہیں وہی پھول وہی روز کے ماہ و انجم — جانے کیوں لگتی ہے ہر چیز حسین آج کی رات

**عرش ملسیانی:** غیر مسلم نعت گو شعرا میں ایک اہم اور قدآور نام عرش ملسیانی کا ہے جو محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ''آہنگ حجاز'' زیور طباعت سے آراستہ ہو کر خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ یہ مجموعہ معیار کے اعتبار سے ایک گراں قدر کارنامہ ہے جو تہنیت و تبریک کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس میں شامل سبھی نعتیں اعلی و ارفع تو ہیں ہی پر کسی مسلم نعت گو شاعر کے محبت و احترام میں ڈوبے دل سے کئی گنا آپ ﷺ کی محبت میں سرشار یہ مجموعہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ عرش ملسیانی کی نعتیہ قد و قامت کے بارے میں عبدالماجد دریابادی رقمطراز ہیں:

"نعت گو ہندو قوم میں بھی اچھے اچھے پیدا ہو چکے ہیں۔ عرش صاحب انھیں میں ایک اچھے نہیں بلکہ مسلموں اور غیر مسلموں کو ملا کر بھی جو مختصر فہرست منتخب نعت گو شعراء کی تیار کی جائے گی، یقین ہے کہ ذوق سلیم اس میں بھی ایک جگہ ان کے لیے مخصوص رکھے گا۔ ۳ ۔

آپ ﷺ کے ساتھ عقیدت، حدت قلبی اور الفاظ کے چناؤ کا سلیس اور رواں اسلوب کے خوب صورت امتزاج سے آپ ﷺ کے تئیں بے لوث اور بے پایاں محبت کو پیش کیا

ہے۔آپ ﷺ کی شان بشر کی انتہا،نبوت کا اوج،نور ہدایت،تنویر شمع خیال جیسے خوب صورت تراکیب سے آپ ﷺ کی ذات اقدس کو منسوب کیا ہے۔آپ ﷺ کی شفاعت کی امید کو اپنی زیست کی جمع پونجی تصور کرتے ہیں۔خوب صورت اور مترنم بحروں میں آپ ﷺ کے تئیں اپنے قلبی جذبات کو اس طمطراق سے پیش کیا ہے کہ کہیں غیر مسلم ہونے کا شائبہ نہیں ہوتا ہے۔ملاحظہ ہو چند اشعار۔

رخ مصطفی کا جمال اللہ اللہ زبان کا وہ حسن مقال اللہ اللہ
نگاہوں پہ جادو، دلوں پہ تسلط جمال اللہ اللہ جلال اللہ اللہ
اتر آئے خود عرش و کرسی سے جلوے نبوت کا اوج کمال اللہ اللہ

حامل جلوہ ازل پیکر نور ذات تو شان پیمبری سے ہے سرور کائنات تو
شان بشر کا منتہا خالق دہر کا حبیب مرد خدا پرست کا آئینہ حیات تو
قلب و نظر کے راز سب دہر پہ منکشف ہوئے روح جہاں راز تو، جہاں مکاشفات تو

الغرض ہر دور میں مسلم نعت گوشعرا کے شانہ بہ شانہ غیر مسلم شعرا بھی رہے ہیں جنہوں نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اس مبارک صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ایسے نعت گو میں جگن ناتھ آزاد،دلو رام کوثری،ستیا پال آنندی،اشونی کمار اشرف،امرناتھ آشفتہ دہلوی،پیارے لال رونق،چندر بھان خیال،تلوک چند محروم،روپ چند،درگا سہائے سرور،فراق گورکھپوری،مکھن لال مکھن،قابل ذکر ہیں۔اوپر کچھ چنندہ شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے ورنہ اگر اس موضوع کے ساتھ انصاف کر کے تمام شعرا کا کما حقہ تذکرہ کیا جائے تو صفحوں کے صفحات سیاہ ہوں گے اور تب بھی یہ موضوع تشنہ طلب رہے گا۔

حوالہ جات: 1۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی،طرزی ایک قادرالکلام شاعر،پرنٹ سینٹر،دریا گنج،نئی دہلی،۲۰۰۴،ص ۱۶۵
۲۔نور احمد میرٹھی،بہر زماں بہر زباں،ادارہ فکر نو،کراچی،۱۹۹۶،ص ۵۰،۴۹
۳۔پنڈت بال مکند عرش ملسیانی،آہنگ حجاز،محبوب المطابع،دہلی،۱۹۵۳،ص ۸

☆☆☆

Hijab Imteyaz : Bahaisiyat Afsana Nigar by Dr. Arif Ayub Shah

(Anantnag) cell-9889991180

ڈاکٹر عارف ایوب شاہ (مٹی پورہ، اننت ناگ)

# حجاب امتیاز بحیثیت افسانہ نگار

حجاب کی پیدائش، پرورش، اور تعلیم وتربیت حیدرآباد میں ہوئی۔ حجاب نے عربی، فارسی ،اردو اور موسیقی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور اسکول سے سینئر کیمبرج کے امتحان کو پاس کیا۔ کم عمری سے ہی ادبی رسائل میں افسانے لکھنا شروع کیا۔ ابتدا میں آپ حجاب 'اسمٰعیل' کے نام سے لکھتی تھیں۔ ان تحریروں میں زیادہ تر خواتین کے جریدے ''تہذیبِ نسواں'' میں شائع ہوتے تھے جس کے مدیر جناب امتیاز علی تاج تھے۔ ۱۹۲۹ میں امتیاز علی تاج نے مشہور زمانہ ڈارمہ ''انارکلی'' کا عنوان ''حجاب'' رکھا تھا اور ۱۹۳۴ میں سجاد حیدر یلدرم کے تعاون سے دونوں ادبی شخیات نے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا۔ شادی کے بعد حجاب اسمٰعیل سے 'حجاب امتیاز علی' میں تبدیلی کے بعد لاہور کی مستقیل شہری بن گئیں۔ ابتدا میں اپنے خاوند کے ہمراہ ایک نشریاتی واشاعتی ادارے سے منسلک رہیں اور کچھ جریدوں میں بطور مدیرہ کے کام انجام دیا۔ حجاب امتیاز علی نے متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی۔ آپ نے افسانے، ناول، ڈرامے، تنقیدی وتخلیقی اور انشائیہ طرز کے مضامین اور کئی تصانیف کے مقدمے بھی تحریر کئے۔ اطفال کے ادب سے متعلق بھی لکھا اور تراجم بھی کئے، تہذیبِ نسواں کی مدیر رہیں اور افسانہ نگاری کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

حجاب نے اپنی تحریری ادب کے آغاز ۱۹۳۲ میں مصنف سجاد حیدر یلدرم کے تعاون سے ترکی ادب کے ترجمہ سے کیا۔ حجاب اپنی المناک اور بعض اوقات گوتھک محبت کی کہانیوں کو خیالی منظر میں ترتیب دینے میں نئی بنیاد ڈالی جو کبھی مشقی بحرہ روم اور جنوبی ہندوستان کے دیگر علاقوں کی یاد دلاتی تھی جہاں آپ پروان چڑھیں۔ غیر ملکی پسِ منظر نے اکثر آپ کے تخریبی ارادے کو چھپانے کے لئے جو تعلیم یافتہ، مراعات یافتہ ہندوستانی مسلم خواتین کی زندگیوں کا خاکہ بنانا تھا جن کی تقدیر طبقے اور قبیلے کے سخت روایتوں، اُصولوں اور پابندیوں نے گھیر رکھا تھا۔ اسکی دلچسپیوں میں آپ کا ایک نفسیاتی تجزیہ تھا۔ ممنوعہ محبتیں، روایت پرستی کی خلاف ورزی کرنے والی خواہشات آپ کے افسانوں کا

مرکزی خیال رہا۔خاص طور پر بعد کی تخلیقات جن میں پُر اسرار اداکارائیں، مئے خوار اداکار، مایوس ،دبی ہوئی ، پست ہمت گھریلو خواتین ، یہاں بے حیائی کی خواہش ہیں۔جن کا مشاہدہ ایک روز مامچہ میں کیا گیا ہے۔جس میں ایک شخص راوی جوخود ایک شاعرہ اور مصنفہ ہیں کو ایک افسانوی داستاں تیار کرنے اور اس کے کرداروں کی حساسیت کو تلاش کرنے کے لئے بے حد جدو جہد کرتی رہیں۔ چند سالوں میں اپ اُردو ادب کی اشاعتی دنیا کی شہزادی بن گئیں۔آپ کے افسانوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ اُردو افسانوں کے شائقین حجاب کے نئے افسانوں کے منتظر ہوتے۔آپ کی عشقیہ افسانوں میں زندگی، حیات کے اتار چڑھاو، بہت سی قدرتی ،خوبصورت اور حساس تصویر کشی ہوتی۔ اپ کے جملوں کی تعمیر کا ایک منفرد انداز ہوتا جن میں چند منتخب الفاظ کے بار بار استعمال سے افسانوں کو پر کشش بنا دیتے اور یقیناً اپ کی مقبولیت نے آپ کو اپنے ہم عصروں سے ہمیشہ ممتاز و مقبول رکھا۔ آپ نے اردو ادب میں اپنا ایک معیار مقرر کرلیا تھا۔''اردو ادب کی صف اوّل کی عشقیہ افسانوں کی ماہر'' حجاب کے افسانوں اور ناول کی خصوصیت یہ تھی کہ آپ ہمیشہ مختلف حالات میں ایک واحد کردار کا استعمال کرتیں، یہ اپنے آپ میں باکمال و نایاب صفت تھی جس نے حجاب کو اُردو ادب میں اپنی ایک الگ شناخت دے دی۔آپ افسانوں اور ناول کے اہم کردار ڈاکٹر گا' سر ہار لے' دادی' زبیدہ' اور حبشاں زونش وغیرہ ہوتے اور یہ تمام حجاب کے اپنے قلم کی تراش تھی جو آپ کے قلم کی سیاہی سے قریب تر ۶۰ سال تک مسلسل چپکے رہے۔اس کے باوجود قارئین ان عام ناموں سے کبھی بیزار نہیں آئے اور حجاب کی تخلیقات کے ساتھ آپ کی زندگی کا ایک خوبصورت یادگار حصہ بنے رہے۔

اردو ادب میں رومانی افسانہ نگاروں کا بنیادی مقصد تلاش حسن،عورت اور اس کے لمس کے احساس و تاثر کے دریچے کھول کر اس حسین کیفیت کے پیچھے دیے ہوئے گوشوں کی تلاش رہا ہے۔ حجاب امتیاز نے اپنے افسانوں میں اس نوعیت کی رومانیت کے ساتھ ساتھ ہیبت ناک واقعات کا اضافہ کیا اور کائینات کی سرسبز و شاداب فصاوں کے دوش بدوش جزبہ تحیر کو کامیابی سے پیش کیا۔حجاب کا افسانوی سفر 1925ء سے شروع ہوتا ہے۔افسانہ نگاری کا آغاز انہوں نے حجاب اسمعیل کے نام سے کیا جو اردو کے نامور ادیب اور ڈراما نگار امتیاز علی تاج سے شادی کرنے کے بعد حجاب امتیاز میں تبدیل ہو گیا اور اسی نام سے دنیائے اردو میں انہیں شہرت حاصل ہوئی۔

حجاب امتیاز کا نام اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں دو حیثیتوں سے سرفہرست ہے اول یہ کہ وہ دنیائے اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جنہوں نے افسانے کے فن اور تکنیک کو ملحوظ رکھتے ہوے

کامیاب افسانے تخلیق کیے، دوسرا یہ کہ انہوں نے سب سے پہلے خوفناک اور تحیر خیز افسانوں سے قاری کو متعارف کرایا۔ موصوفہ کے چار افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں اور تحقیقی دائرے کے اندر آنے والے ان کے تقریباً ساٹھ افسانے ہیں جو ان کے چار افسانوی مجموعوں (1) میری ناتمام محبت (2) لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے (3) صنوبر کے سائے (4) وہ بہاریں یہ خزاہیں اور مختلف رسائل میں محفوظ ہے۔

حجاب کے افسانوں کی دنیا رنگا رنگ اور دلچسپ ہے۔ اپنے رومانی انداز بیان، شگفتہ تحریر اور تخیل کی اونچی اڑان کے سہارے قاری کی دلچسپی کے تمام سامان اپنے افسانوں میں مہیا کیے ہیں۔ جن کی بدولت قاری چند لمحوں کے لیے زندگی کی سخت اور تلخ حقیقت سے آنکھیں موند کر پیدا کردہ تخلیقی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ بیدار ہونے پر وہ زندگی کی ٹھوس دنیا میں واپس آجاتا ہے۔ مگر لمحاتی مسرت اس کے ذہن کی کسی گوشے میں کسی حسین حادثہ کی طرح محفوظ رہتی ہے۔ یہی حجاب کے فن کی خوبی اور اسلوب کی جدت ہے۔ ان کو قدرت کے حسین مناظر سے بے پناہ محبت ہے۔

حجاب اپنے افسانے کا آغاز عموماً کسی شعر سے کرتی ہیں۔ کسی بھولی بسری یاد کا سہارا لے کر کسی سفر کے خوشگوار یا ناخوشگوار واقعے کی بنیاد پر یا پھر بچپن کی شرارتوں کے تحت واقعات در واقعات کا ایک ہالہ تیار کرتی ہے اور اپنے حسین اور دلکش انداز بیان کے سہارے اس میں رنگ و روغن بھرتی ہے۔ اس تخلیقی عمل میں ان کا تحیر انگیز موڑ افسانے کے ماحول کو بے حد موثر بناتا ہے۔ ان کے اکثر افسانوں میں تجسس اور تحریر کے عناصر بھرپور موجود ہیں۔ لیکن رومانیت بھی ان کے افسانوں کا ایک خاص وصف ہے۔ گویا حجاب کے تمام افسانوں کا خمیر خواب اور خمار سے تیار شدہ ہے۔ خاص طور سے مجموعہ "لاش" کے افسانوں میں عالم ارواح کے دہلا دینے والے واقعات بیان کیے ہے۔ بھوت، لاش، کفن اور کافور کا ذکر کر کے انہوں نے ماحول کو خوفناک بنا دیا ہے۔ افسانہ "نارنگی کلیاں" کا یہ اقتباس پیش خدمت ہے؛

"او مالک! میں اس عجیب و غریب رات کو کبھی نہ بھولوں گی، اپنی زندگی بھر نہ بھولوں گی"۔

ان کے فن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ماحول کو سحر زدہ کرنے کے لیے شروع میں تجسس کے عناصر کو تیز کرتی ہے۔ روح، زندگی اور خواہش سے بنے مثلث اور اس کے ماحصل کو حجاب نے افسانہ "دریائے شون کا پل" میں بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانے کا آغاز اس طرح کرتی ہے؛

"کیا ساکنات عالم ارواح کا ہماری مادی دنیا سے کوئی تعلق ہوتا ہے؟ کیا وہ نفرت یا محبت کے موقعوں

پر کسی اشد ضرورت پر چند لمحوں کے لیے پھر مادی دنیا میں آنے کی کوشش کرتے ہیں۔"
(دریائے شون کا پل تہذیب نسواں یکم جولائی (1933

جذبہ تحیر کو بیدار کرنے کے لیے حجاب اس طرح خوفناک منظر پیش کرتی ہیں۔

دفعتاً میں نے شیشے کی دوسری طرف ایک خوف محسوس کیا، پلٹ کر دیکھا تو بس میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔(لاش نیرنگ خیال سالنامہ 1933 ص 31

حجاب امتیاز علی نے اپنے افسانوں میں حیرت، استعجاب اور خوفناکی سے رومانیت پیدا کی ہے اور ان میں فلسفہ حیات کی کارفرمائی جلوہ گر ہے۔ حجاب امتیاز علی اُردو ادب کی ایک معروف مصنفہ، مدیرہ اور روز نامچہ نویس، اردو رومانیت کی علمبردار ہیں۔ حجاب کی رومان پسندی، شوخی، بے باکی اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف انقلابی پیکر، مستعمل ہے اور بغاوتِ نسواں کی ایک چنگاری ہے۔ لیکن آپ کی مذہب پرستی پر کوئی حرف نہیں۔ خدا اور رسول پر یقین، صوم وصلوٰت کی پابند تھیں۔

حجاب کا تعلق ریاست حیدرآباد دکن کے ایک معزز شاہی خاندان سے ہے۔ آپ ۴ نومبر ۱۹۰۸ میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد سیّد نواب سر محمد اسمٰعیل نظام حیدرآباد کے پہلے سیکریٹری تھے۔ انہوں نے ملازمت کی سبکدوشی کے بعد مدراس میں سکونت اختیار کر لی۔ والدہ عبّاسی بیگم اپنے وقت کی مشہور و معروف ناول نگار تھیں۔ انکے ناول ''زہرا بیگم'' اور فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ ''گل صحرہ'' انکی بہترین یادگار ہیں، حجاب انہیں والدین کی چھوٹی شہزادی اور نواب زین یار جنگ کی برادرزادی تھیں۔ علاوہ ازایں برِصغیر کی لائسنس یافتہ اوّل خاتون پائلٹ کے طور پر بھی ایفائی کیں۔ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے آپ نے لاہور فلائنگ کلب کے زیر اہتمام کئی مقابلوں میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۹ میں The inernational Women's news نے یہ خبر عام کردی کہ بیگم حجاب امتیاز علی برطانوی سلطنت کی پہلی مسلم خاتون پائلٹ بن گئیں ہیں۔ آپ نے بطور فضائی پائلٹ ''A'' لائسنس حاصل کیا۔ آپ ادبی حلقہ میں 'مان۔او۔سلویٰ' کی بانی تھیں جو کے ۱۹۹۷ آخر تک فعال رہیں جب اپ کو ہلکا فالج کا دورہ پڑا۔ آپ کے بہت سے ادبی کارناموں کے انگریزی، جاپانی اور دیگر زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ آپ کے کئی پروگرام ریڈیو سے نشر ہوئے ہیں۔ آپ نے برِصغیر کے افسانوں میں قرون وسطیٰ عناصر اور کچھ نفسیاتی عناصر کو بھی متعاف کروائیں۔

ایک پیدائشی مصنفہ کی بہترین تخلیقات میں سے ایک ''میری ناتمام محبت'' ہے۔ اُردو ادب میں لکھا جانے والا بہترین محبت کا افسانہ ہے جو آپ کے ابتدائی دور کا ایک شاہکار ثابت ہوا اور اس

افسانہ سے آپ کی ادبی دنیا میں بے انتہا شہرت حاصل ہوئی اور صاحب ادب، ہم عصروں اور قارئین نے آپ کا دلی استقبال کیا۔ اس افسانہ کو آپ نے ۲۱ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ یعنی یہ تحریر ایک نابالغ ذہن کی تراش ہے۔ مگر اس میں حسن و عشق کی واردات کو ایسی گرم جوشی اور بے باکی سے بیان کیا گیا ہے کہ دل رنج و غم سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ آپ کے اس افسانے میں زندگی کی حرارت موجود ہے اور اس میں زبان، بیان اور فکر و فن کی تمام تر خوبیاں بڑی آب و تاب سے جلوہ گر ہیں۔

حجاب کے دیگر افسانوں اور ناول کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔ تحفے، تصویرِ بتاں، خلوتِ انجمن، گلستاں اور بھی ہیں، وہ بہاریں، یہ خزائیں، کالی حویلی، لیل و نہار، اندھی محبت، اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا، ممی خانہ افسانوں کا مجموعہ جس میں رات، ہمجنس با ہمجنس، احتیاط عشق، محبت یا ہلاکت، جنازہ، وہ طریقہ ''بتا دو تمہیں چاہیں کیونکر'' وہ قدیم اداس رات، بیمار غم، مہمان داری، یادرفتگان، کونٹ الیاس کی موت، کالی حویلی، افسانوں کا مجموعہ وغیرہ۔

آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام اپنے بچوں کے ساتھ ماڈل ٹاون لاہور کے آرام دہ گھر میں گزاریں۔ حجاب امتیاز علی ۱۹ مارچ ۱۹۹۹ کو لاہور میں انتقال کر گئیں اور آپ کے جسد خاکی کو لاہور کے مومن پورہ قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ حجاب کی دختر یاسمین طاہر، ریڈیو پاکستان میں بطور مغنی ایک قابل ذکر آواز بن گئیں ہیں اور بے حد مقبول ہیں اور آپ کے پوتے فرہان طاہر اور علی طاہر اداکاری کی دنیا کے روشن ستارے ہیں۔

حجاب کی فنی مہارت یہ ہے کہ وہ تحیر خیز واقعات کا تانا بانا بن کر قاری کے ذہن کو خوف کی اندھیری راہوں میں سے لے جاتی ہے اور دور تک لے جانے کے بعد احساس کی ایسی چکا چوند شمع جلاتی ہے کہ قاری اب تک جو خوف و ہراس محسوس کرتا نظر آتا تھا ایسی حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے کہ ڈرنے کے بجائے احساس کے ملبے میں دبی حقیقت کو پا کر تشدر رہ جاتا ہے، کہ جس چیز سے اسے ڈر لگتا تھا وہ دراصل دھول میں اٹی اس کی اپنی ذات سے وابستہ حقیقت ہے۔ افسانہ ًلاش ً کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

ً جونہی میں نے اسے کھولا، میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ میں نے دریچے کا سہارا لیا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ آہ میں کیا کہوں .....اس صندوق میں کیا تھا! خود اپنی لاش.... میری لاش!!!

ً (لاش ً نیرنگ خیال سالنامہ 1933 ص 40

حجاب کبھی تصوراتی دنیا میں اصل زندگی کا رنگ اس طرح چڑھاتی ہے کہ اس کی آمیزش

سے وجود میں آنے والی افسانوی دنیا محض تخیلی نہ رہ کر حقیقی زندگی سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ وہ افسانہ "نادیدہ عاشق" میں عورتوں کی سماجی حیثیت کو بڑے دردناک اور موثر لہجے میں پیش کرتی ہیں۔

"ہم مشرقی لڑکیاں اک قسم کا اناج ہوتی ہے کہ خاندان کے بزرگ جس کھیت میں چاہے بودیں۔ یا ہماری مثال بکریوں کی ہے جن کی قیمت کے مالک قصائی ہوتے ہیں اور جب چاہے جس وقت چاہے ذبح کر دیں۔ (نارنگی کلیاں نیرنگ خیال عید نمبر 1931 ص105

جذبات واحساسات اور تخیل کی بلند پروازی کی طرح حجاب فطرت کے حسین منظر کو پیش کرنے کی بھرپور قدرت رکھتی ہے۔ انہیں بلبل کی آواز میں کائنات کا نغمہ سنائی دیتا ہے کہ بلبل کی آواز عہد قدیم کے قصوں کی یاد دلاتی ہے اور انسان الوہیت کے مابین ترجمانی کے فرائض انجام دیتی ہے۔

"ہماری روح دنیا میں تکالیف ومصائب، اضطراب و بیامنی کے غیر دلچسپ اور ڈراونے خواب دیکھنے کے لئے بھیجی گئی تھی، مگر ائے حسن وعشق کے دیوتا تیرے نغمے ہماری خوابوں کی وادی کو اور تیرا حسن ہمارے تخیل کے راستے کو منور کر رہا ہے۔ (بلبل" نیرنگ خیال اکتوبر 1930)

حجاب کے اسلوب کی ندرت اور برجستگی ان کے دلکش اور مرصع انداز بیان میں پوشیدہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ترنم اور اشاریت کے ساتھ تشبیہات واستعارات کا خوبصورت ان کی شدید جمالیاتی حسن کی نشاندہی کرتا ہے، جس کی وجہ سے قاری ان کی تحیر خیز دنیا میں سفر کرنے کے لئے بے خطر کود پڑتا ہے۔ حجاب کے افسانوں کے پلاٹ متمول گھرانوں سے متعلق ہے۔ ان کے کرداروں نے دولت وثروت کے سایے میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے ان کے افسانوں میں آسودگی، خوشحالی اور تروتازگی محسوس ہوتی ہے۔

☆☆☆

Sir Allama Iqbal : Bahaisiyat Falsafi by Dr. Asif Ali Jan (Anantnag)

ڈاکٹر آصف علی جان (اننت ناگ) 7006602834

# سر علامہ اقبال بحیثیت فلسفی

علامہ اقبال کی شخصیت اور اُن کی فکری اور فلسفیانہ جہات کو چند صفحات میں سمیٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، فلسفی، مفکر اور معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم دانشور اور مصلح قوم تھے۔ انہوں نے اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے شاعری کو وسیلہ اظہار بنایا۔ اردو شاعری میں بالخصوص اردو نظم میں موضوعاتی اور فنی سطح پر جتنے اور جیسے تجربات کیے وہاں ان سے پہلے اور انکے بعد کے شعراء کوشش کے باوجود اُنکے معیارِ فن اور فکر تک نہیں پہنچ سکے۔ علامہ اقبال اپنے زمانے کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور بڑے شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ امکانات کی تمام راہیں ختم کر دیتا ہے وہ تجربہ اور تخیل کی گنجائش باقی نہیں رکھتا۔

علامہ اقبال ایک دردمند اور حساس شاعر تھے جس کا اظہار انہوں نے کہیں شکوہ و شکایت سے کیا اور کہیں قوم کو ماضی کی یاد دلا کر۔ جو کام ایک قائد اپنے افکار و اعمال سے کرتا ہے وہی کام علامہ نے شاعری کے زریعے کیا۔ شاعری میں اسلامی فلسفہ و فکر کو جگہ دے کر جہانِ معنی پیدا کر دیے۔ انہوں نے قوم کی نبض شناسی کا کام کیا اور اسے جگانے کے لئے ایک الگ پیرائے اظہار اختیار کیا۔ اقبال وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالی نے اُس زمانے کے مطابق بعض حکم و حقائق کہلوائے جو کسی دوسرے معاصر شاعر و مفکر کی زبان سے نہیں ادا ہوئے وہ ایمانِ کامل اور حب صادق کا مجسمہ تھے اور اِسی چیز نے ان کی شاعری میں جوش، ولولہ اور سوز و گداز پیدا کر دیا۔ اُن کی شخصیت کو بنانے، سنوارنے اور سجانے میں سب سے بڑا عنصر قرآنی تعلیم کا ہے۔ پوری زندگی قرآن مجید پر غور و فکر اور تدبر و تفکر کرتے گزری جس سے ان کے ذہن و دل پر نئے نئے علوم کا انکشاف ہوا۔

قرآن مجید سے محبت اور عشق رسول ﷺ نیا نھیں فکری بلندی اور ایمانی پختگی عطا کی اور اسی چیز نے انہیں عرفانِ نفس اور خودی جیسے عناصر سے مالا مال کیا۔ عرفان نفس اُنہیں عرفان ذات تک لے گیا جس کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

یہ عرفانِ نفس کا ہی کرشمہ تھا کہ وہ فکری گمراہی اور ادبی بے راہ روی سے محفوظ رہے۔ اقبال نے اول دن سے ہی اپنی ذات اور شخصیت کو اچھی طرح پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ اُنہیں اپنی وہبی اور فکری صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا اور پھر انہی قوتوں کو شعری پیکر میں ڈال کر مسلمانوں کی زندگی میں ایک نئی روح پیدا کرنیکا وسیلہ بنا لیا۔ مسلمانوں کو جذبہ حریت اور سیادت وقیادت کا احساس دلایا اور ان کے اندر دبی ہوئی ایمانی چنگاریوں کو بھڑکانے میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کیا۔ اقبال کہتے ہیں۔

ہے اگر مجکو خطر کوئی تو اس امت سے ہے اس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اپنی نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں اس جذبہ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں کچل ڈالا تھا جس نے پاوں میں تاجِ سرداراں

عرفانِ نفس کے بعد جس چیز نے اُن کی شخصیت کو بنایا وہ اُنکی "آہِ سحر گاہی" ہے۔ جس نے اُنکی شاعری کو نئے معانی اور قوتِ تاثیر عطا کی۔ اُنکا آخری شب میں بیدار ہونا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہونا، گڑگڑانا اور رونا یہی وہ چیز تھی جس نے اُنکی روح کو ایک نیا نشاط اور قلب کو ایک نئی روشنی عطا کی۔

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی
زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

علامہ اقبال یہی خوبی یعنی آہِ سحر گاہی اُمت مسلمہ کے نوجوانوں میں دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ وہ جوانوں میں آہِ سوز اور درد وتپش دیکھنے کی تمنا کرتے تھے اور خدا سے دعا کرتے تھے کہ میرا سوزِ جگر اور میرا عشق ونظر اِن نوجوانوں کو بھی عطا کر۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے تو اِن شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

علامہ اقبال کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں مولانا رومی کے افکار وخیالات ان کی مثنوی "مثنوی معنوی" کے ذریعے پہنچے کا بڑا حصہ ہے۔ مثنوی معنوی "اپنے اندر قوتِ حیات کے ساتھ ساتھ ادبی بلندی، معانی کی جدت، حکیمانہ مثالوں اور نکتوں کے بیش بہا خزینے سمیٹے ہوئے ہے۔ رومی کے خیالات وافکار اور فلسفیانہ توجیہات نے ہر عہد کے انسانوں کو متاثر کیا۔ اقبال نے پیر روم کو اپنا کامل

رہنما تسلیم کیا اور صاف صاف اعلان بھی کر دیا کہ عقل وخرد کی ساری گتھیاں جسے یورپ کی مادیت نے الجھا رکھا تھا۔ ان کا حل صرف آتش رومی کے سوز میں پنہاں ہے اور میری نگاہِ فکر اسی کے فیض سے روشن ہوئی۔

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے تیرا — تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن — اسی کے فیض سے میرے سبوٗ میں ہے جیحوں

مولانا روم سے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار اقبال بار بار کرتے ہیں اور انہیں "پیر روم" کے نام سے یاد کرتے ہیں:

صحبت پیر روم نے مجھ پر کیا یہ راز فاش — لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

علامہ اقبال کی شخصیت کا اندازہ انکے افکار ونظریات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے انکے بنیادی تصورات میں خودی، عقل وعشق، مردِ مومن، وطنیت وقومیت، مغربی تہذیب وغیرہ۔ ہیں۔ انہی تصورات اور فلسفیانہ تفکرات پر انکی شاعری کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔ جب وہ خودی کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے ہاں خودی خود پرستی، انانیت، خودسری کے معنی میں نہیں آتی بلکہ خودی رازِ درونِ حیات، بیداریِ کائنات، خودشناسی، ضبط نفس، اطاعت الٰہی، ذوق طلب، سرچشمے جدوندرت کے معنی میں آتی ہے۔ خود کو جاننا پہچاننا اور اپنے وجود کے ہونے اور نہ ہونے کی اہمیت کا ادراک کرنا ہی خودی ہے۔ علامہ کہتے ہیں:

خودی کی یہ ہے منزل اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

خودی کے بعد عشق کا معاملہ آتا ہے۔ علامہ اقبال عشق کی بے پناہ قوت کو بیان کرتے ہو فرماتے ہیں۔

عشق کے مضراب سے نغمہ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

ان کے مطابق عشق ایک سرمدی، مسلسل اور حیات آفریں قوت ہے جو نہ صرف سوزِ سازِ زندگی کو متحرک کرتا ہے بلکہ اس کے بہاو کو بھی قائم رکھتا ہے۔ اقبال عشق کا ایک گہرا اور جامع تصور رکھتے تھے اور اس میں بہت کچھ فیضان پیر رومی کا بھی شامل ہے دونوں کینز دیک عشق محض ایک جذبہ نہیں بلکہ حقیقت کے ادراک اور اس پر دسترس حاصل کرنے کا موثر وسیلہ بھی ہے۔ دونوں کے لئے عشق ایک آفاقی جذبہ ہے۔

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو عشق خود ایک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

عشق ماضی، حال اور مستقبل کو ایسے پیوست کر دیتا ہے کہ ان کے درمیان تقسیم، تفریق اور تمیز ممکن ہی نہیں یہ بیک وقت ایک طرح کی تکوینی قوت بھی ہے اور تزینی شکل بھی۔ یعنی یہ نشوونما اور ہم آمیزی کے عمل سے بھی مشابہ ہے اور اس کا نچوڑ بھی۔ علامہ اقبال نے عشق کو دمِ جبرئیل اور دمِ مصطفیٰ کہہ کر اسے فیضان اور حق کا مترادف قرار دے دیا ہے اور اسے خدا کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خدا کا کلام کہہ کر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ لفظ، کلام اور وجود ایک ہی وحدت کا نام ہیں۔

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

یعنی عشق شریعت اسلامی کا سب سے بڑا محافظ اور شارح ہے۔ یہی مومنوں کے دلوں میں جذبہ ایثار پیدا کرتا ہے۔ عشق نہ ہوتا تو زندگی کے ساز سے کوئی نغمہ برآمد نہ ہوتا یعنی زندگی موجود نہ ہوتی اور زندگی میں شانِ جمال اور شانِ جلال بھی نہ ہوتا۔ عشق کے بعد علامہ اقبال نے مردِ مومن کو شعری استعارہ کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اقبال مردِ مومن کو خدا کے جلال و جمال میں حصہ دار بناتے ہیں وہ تخلیقی قوت میں خدا کے ساتھ برابر کا شریک ہو جاتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا، بندہ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

مردِ مومن کو مردِ سپاہی کہہ کر مراد مثالی انسان کی لی ہے یعنی جو خالقِ تقدیر بھی ہو اور اپنی کائنات کا خالق بھی۔

مردِ سپاہی ہے وہ، اس کی زرا "لا الہ" سایہ شمشیر میں اس کو پنہ "لا الہ"

لا الہ اشارہ ہے وحدانیت پر مکمل یقین کا۔ اسی یقین کی بدولت انسان کی تخلیقی قوتیں بھرپور طریقہ سے نشوونما پاتی ہیں۔ وہ "لا" سے "الا" کی طرف آتا ہے اُس کے سفرِ زیست میں یہ دو اہم مقام آتے ہیں جہاں وہ دو ذہنی رویوں سے دوچار ہوتا ہے نفی اور اثبات۔ علامہ کہتے ہیں کہ مردِ مومن کے دل میں توحید الٰہی اس درجہ جاگزیں ہو جاتی ہے کہ وہ ماسوائے کے غلبہ اور تسلط سے ہمیشہ بینیاز رہتا ہے۔ زماں و مکاں کی حد بندیوں سے ماوراء اور بینیاز ہو جاتا ہے۔ بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی: "اس کا ایمان وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد دائرہ عالم گھومتا ہے، اس کی ذات کائنات کی اصل وحقیقت اور اس کے سوا سب طلسم ومجاز، اور وہم وگمان ہے، وہ عقل وفکر کی غایت اور ایمان ومحبت کی نہایت ہے، اس کے وجود سے کائنات میں خوش نمائی ورعنائی اور زندگی میں قوت وبہجت کا اجتماع ہے، وہ عشق کی منزل، محبت کا حاصل اور جسم وجود کا دل ہے" (نقوشِ اقبال، ص ۱۵۸)

اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو رزم ہو یا بزم ہو پاک دل پاک باز

اسی طرح علامہ اقبال وطنیت وقومیت اور مغربی تہذیب کے اثرات کو ایک الگ انداز اور نقطہ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی تلقین کرتے ہیں چونکہ خود علامہ اقبال وطن دوست تھے لیکن وطن پرست نہیں۔ انہیں اسلام اور قوم پرستی میں کھلا تضاد نظر آتا ہے۔ وہ ملت اور اسلام کی آفاقیت کے قائل رہے۔

ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اُن کا ماننا تھا ہجرت کا اصول انسان کو عالمی انسانیت اور عالمگیر انسانی برادری کا ایک عظیم سبق تھا۔ وہ کہتے ہیں:

ہے ترک وطن سنتِ محبوب الٰہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

علامہ اقبال کے مطابق اسلام اور مسلمان کسی ملک وسرزمین پر انحصار نہیں کرتے، اسی لئے ملکی حدود کی تبدیلی، سیاسی عروج وزوال اور فتح وشکست سے اس انداز میں متاثر نہیں ہوتے جس طرح ملک ونسب پر انحصار رکھنے والی قومیں ہوتی ہیں۔

☆☆☆

Afsana"Azadi Ki Talash" : Ek Jayeza by Irfan Ahmad Dar

عرفان احمد ڈار

# افسانہ ''آزادی کی تلاش'': ایک جائزہ

شبنم قیوم کا شمار جموں وکشمیر کے نمائندہ فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔وہ بنیادی طور ناول نگاروں کی حیثیت سے جانیجاتے ہیں مگر انھوں نے ناول نگاری کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھے ہیں ان کے اب تک کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکے ہیں۔انھوں نے وادی کشمیر کیسیاسی حالات کو زیادہ توجہ دی ہیاور یہی حالات ہمیں ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں ایک طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تحریک آزادی کشمیر کو شبنم قیوم نے بڑی گہرائی سے جانا پرکھا اس کا مشاہدہ کیااور پھراس تحریک کو انھوں اپنے افسانوں، ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔اس کے علاوہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ دور میں چند افسانہ نگار جو اکیسویں صدی میں لکھ رہے ہیں ان میں شبنم قیوم کا شمار بھی ہوتا ہے۔اور وہ بزرگ نسل میں شمار ہو کر ن ءنسل کے لیے ایک راہ اختیار کیے ہوے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے تاریخ اور تحریک پر اپنا لوہا منوایا ہے اور آج بھی بڑے شان وشوکت کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ان کی افسانہ نگاری کے متعلق کرشن چندر نے لکھا تھا:

"شبنم قیوم کو کہانی کا فن آتا ہے۔اور ان کے ہاوادی کشمیر کی زندگی کا متنوع مشاہدہ موجود ہے۔اور اسے نفسیاتی طور پر جذبات کرنے اور پھر فکر وفن کے پانچوں میں ڈھالنے کی قوت بھی!شبنم قیوم واقیت اصلیت اور حقیقت کی عکاسی میں کہیں کہیں شاعرانہ انحراف کے قائل بھی نظر آتے ہیں۔ادب میں اگر فنکار تصوف یا غلو سے کام نہ لے تو ادب اور فوٹو گرافی میں کیا فرق رہ جاے۔۔''

(بحوالہ۔۔نشانات از شبنم قیوم،ص 2007ء،ص14)

افسانہ آزادی کی تلاش شبنم قیوم کا ایک اہم اور مشہور افسانہ ہے غالباّ ان کے سارے افسانے تین زمرے میں منقسم ہوتے ہیں۔پہلا زمرا افسانہ دوسرا زمرہ مختصر افسانہ اور تیسرا زمرہ طویل افسانہ اور ان کے سارے افسانے تحریک آزادی کے دور کی پیداوار ہیں۔آزادی کی تلاش افسانہ بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔اسی افسانے کی عنوان پر ہی ان کے افسانوی مجموعہ کا عنوان طے پایا ہے۔یہ افسانوی مجموعہ 2015 میں منظر عام پر آیا ہے اور اس میں تیرہ افسانے شامل ہیں۔یہ پورا افسانوی

مجموعہ تحریک آزادی کشمیر کے تناظر میں لکھا گیا ہے اس کی تمام کہانیاں تحریک سے وابستہ ہے اور شبنم قیوم نے الگ الگ واقعات، حادثات جو وادی میں سیاسی ماحول کی وجہ سے رونما ہونے ہیں ان کو موضوع بنایا ہے۔ان کا ہر افسانہ ایک الگ واقعات ایک حادثے کو پیش کرتا ہے۔مصنف کا ماننا ہے یہ انھوں سچے واقعات کی بنیاد پر لکھے ہیں صرف افسانوں کے کردار اور ماحول کو افسانوی انداز دیا ہے باقی تمام واقعات حقیقت پر مبنی ہیں۔اس چیز کو اگر ہم مدنظر رکھے اس افسانے کا اگر ہم جائزہ لے تو یہ بات بھی مستند ہیں کہ یہ افسانہ بھی حقیقت کی پس منظر میں لکھا ہے۔اس کے کرداروں کے نام اور افسانوی پن یا فکشن کا ماحول پیدا کیا ہے اور افسانے میں وہ مسائل پیش کیے گئے ہیں جو تحریک آزادی کہ وجہ سے عروج پر آئی ہیں اسی تحریک ان ہی حالات اور سیاسی منظر نامے نے پیدا کیا ہے اس لیے اس افسانے کو ہمیں تحریک آزادی کشمیر پس منظر میں لکھے گئے اہم افسانوں میں شمار کرنا چاہیے اور ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ قارئین نے اس افسانے کو ایک سچے واقعات کے طور پر ہی لیا ہے۔

فنی اور موضوعاتی اعتبار سے افسانہ "آزادی کی تلاش" کامیاب نظر آتا ہے۔مصنف نے آغاز سے لے کر اختتام تک افسانے میں تجسس اور دلچسپی کی کیفیت برقرار رکھی ہے۔شبنم قیوم تحریک آزادی کے کے جذبات سے لبریز ہیں اور اس افسانے میں ہمیں وادی کشمیر کی عوام کا درد اور کرب محسوس ہوتا ہے یہ وہ درد ہے جس کو ہندوستانی سیاست اور ہندوستانی فورسز نے نہ صرف وادء کشمیر بلکہ پورے جموں کشمیر کی عوام کو دیا ہے۔جدوجہد آزادی کا سلسلہ تقسیم ہند کے بعد سے لے کر آج تک مسلسل جاری ہے یہ جدوجہد عوام نے اور عوامی رہنماؤں کی دین ہیں اور اس جدوجہد سے متاثر عام انسان ہی ہوا ہے اسی کشمکش کو ہندوستانی فوج نے کچلنے کی کوشش کی ہے۔اس تحریک کے سبب پیدا شدہ مسائل کو شبنم قیوم نے اپنے اس افسانے میں بڑی ہنرمندی اور چابک دستی سے پیش کیا ہے۔

اس افسانے کا آغاز بڑی فنی پختگی سے ہوتا ہے مصنف نے فن کا جگہ جگہ خیال رکھا ہے اور کئی بھی اپنے جذبات کو فن پر حاوی نہیں ہونے دیا ہے تجسس کی کیفیت افسانے کے آغاز سے ہے شروع ہوجاتی ہے۔افسانے کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

"دلی کی تاریخی جامع مسجد سے عصر کی نماز پڑھ کر میں باہر سڑک پر آیا تو چاے کا کپ پینے کی چاہت لے کر آگے بڑھا،سڑک پر کافی بھیڑ تھی،سڑک کے بائیں جانب تین سپاہی کھڑے تھے ان میں سے ایک سپاہی ایک جوان کو تھپڑ مار کر اسے گالیاں دے رہا ہے۔تھپڑ سہنے والا مجھے کشمیری لگا۔میں قریب

آیا۔تو یہ سپاہی جس نے کشمیری جوان پر تھپڑ رسید کی کی تھیں اب کے بارے میں دوسرے سپاہیوں سے کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔'دیکھا یہ کشمیری اچھے بلے تو ٹھیک۔پاگل بھی آزادی مانگ رہے ہیں۔"(افسانہ،آزادی کی تلاش۔ازشبنم قیوم)

افسانے کی تکنیک بیانیہ ہے جو واحد تکلم سیغے میں پیش ہوئی ہے۔افسانہ کافی طویل ہے اور کئی واقعات کو سمیٹے ہوے ہیں۔افسانے کی طوالت کے سبب قارئین کی توجہ ک ءک ءٹوت جاتی ہیں اس لیے پلاٹ میں ک ءک ءالجاو محسوس ہوتا ہے لیکن اگر قاری بغور مطالعہ کرے تو یہ طوالت محسوس نہیں ہوتی اور پھر افسانے کی تکنیک اور پلاٹ دونوں مناسب اور فطری معلوم ہوتے ہیں۔حالانکہ مصنف نے جن مختلف واقعات کو مربوط کیا ہے وہ بالکل فطری ہے لیکن طوالت کے سبب اس پلاٹ کو ہم چست نہیں کہہ سکتے ہیں۔اس افسانے کے فن پر مزید بحث کرنے سے پہلے افسانے کا خلاصہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

راوی دلی کی تاریخی جامع مسجد سے عصر پڑھ کر جوں ہی گیٹ سے باہر قدم رکھتا ہے سڑک پر لوگوں کی قصیر تعداد موجود ہوتی ہیں۔سڑک کے ایک طرف سے تین سپاہی کھڑے ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک سپاہی ایک جوان کو تھپڑ مار کر اسے گالیاں دیتا ہے۔تھپڑ سہنے والا شکل سے کشمیری لگتا ہے۔میں تھوڑا آگے بڑھتا ہوں اور وہ سپاہی دوسرے سپاہیوں سے کہہ رہا تھا۔کشمیر کے اچھے بلے تو ٹھیک لیکن پاگل بھی آزادی مانگ رہے ہیں۔راوی اس شخص کو اپنے ساتھ جامع مسجد کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوتا ہے میری طرف دیکھنے کے بجائے وہ اپنا سر جھکا کر خود کلامی کرنے لگتا ہے۔جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے یہ شخص دماغی توازن خو بیٹھا ہے۔میری باتوں کا جواب دینے کے بجائے خود سے ہی کہہ رہا ہے۔

"وہ کہاں گئی۔۔۔،کدھر چلی گئی۔وہ۔۔۔۔آزادی میرے پاس آئی تھی۔میں نے اسے جانے کیوں دیا۔۔۔اب میں،میں اپنی آزادی کو کہاں ڈھونڈں گا۔۔۔۔،کہاں گئی وہ مجھ کو چھوڑ کر۔۔۔۔،میں نے اسے جانے کیوں دیا۔۔۔۔،اس کو زخم لگتے تھے نا۔۔۔۔جسمانی زخم۔۔۔۔۔۔اور روحانی زخم۔۔،اس کی عزت بھی لٹ گئی تھی نا۔۔۔۔،آب تو وہ لاپتہ بھی ہوگئی۔۔۔۔کہاں ملے گی اب وہ۔۔،میں نے آزادی کو جانے کیوں دیا۔کیا میں نے آزادی کو کھو دیا ہے۔اب میں کیا کروں۔۔!میں کہاں کدھر جاؤں۔۔"(افسانہ،آزادی کی تلاش۔ازشبنم قیوم)

راوی اس بے بس بظاہر پاگل،دماغی طور ان فٹ شخص کو غور سے سنتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ

یہ شخص جو مختصر الفاظ بولتا ہے مگر وہ تاریخی اور تحریکی کتاب پڑھ رہا تھا اور میں غور سے سن رہا تھا۔ راوی جب دلی سے کشمیر واپس آجاتا ہے یہاں سے کہانی دوسری طرف رخ موڑتی ہے راوی کتاب کے ورق کو پلٹا ہے تو وہ دیکھتا ہے ساجدہ اپنی ڈیڑھ سال کی بچی کے مستقبل کے باریمیں بڑی فکرمند ہوتی ہے۔ آج یہ بچی دو سال کی ہو چکی اس نے اپنے بابا کو آج تک نہیں دیکھا ہے یہ گھر میں اکیلے ہوتی ہیں گھر کے سبھی افراد اپنے اپنے کام سے باہر چلے جاتے ہیں۔ اچانک دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ یہ لرزتی، اس کے اوپر خوف سا طاری ہوتا ہے، تھرتھراتی، آخر ہمت کر کے دروازے کی اور آجاتی ہے۔ دستک کرنے والے شخص کو کہتی ہے کہ گھر میں کوئی نہیں ہے "اگر کوئی ضروری کام ہے تو شام کو آجانا'۔

یہاں تک مصنف خود بطور راوی افسانے میں شامل رہتا ہے پھر اس کے بعد راوی جوں ہی کشمیر پہنچتا ہے تو کہانی ایک نیا رخ لیتی ہے۔ اصل میں یہ کہانی افتخار نامی ایک شخص کی ہے۔ اور اسی کے ماضی پر راوی فلش بیک میں چلا جاتا ہے۔ افتخار کی زندگی بڑی آرام سے چلتی تھی وہ ایک استاد کی حثیت سے کام کرتا تھا اور اپنے والدین کے لیے کمانے کا ذریعہ تھا مگر اس کے ذہن میں وادی کے افسردہ حالات اکثر انقلاب کی صورت اختیار کرتے رہتے تھے۔ ظلم کو برداشت کرنا اس کی حد سے باہر تھا اس لیے کبھی کبھی طبعیت بغاوت پر آمادہ کرتی تھی۔ شادی کے بعد اس سے حالات اس قدر مجبور کرتے ہیں کہ وہ کشمیر سے سرحد پار چلا جاتا ہے جہاں وہ عسکریت پسندوں کی راہ اختیار ک لیتا ہے وہاں سے وہ ایک trained گروپ کے ساتھ واپس آجاتا ہے اور پوشیدہ جگہ رہتا ہے۔ یہاں اسے اپنی بیوی اور بچے کی یاد آتی ہے تو وہ اپنے ایک ساتھی کو اپنی بیوی کو ملاقات کی خبر بھیجتا ہے ان کا وہ ساتھی ان کی بیوی کو لے کر اس پوشیدہ جگہ پر پہنچتا ہے مگر انھیں یہ پتہ نہیں ہوتا ہے کہ ہندوستانی افواج کی نظریں ہمیشہ ان پر رہتی ہے اس کی بیوی جیسے ہی اس پوشیدہ جگہ پر پہنچتی ہے تو ہندوستان فوج انھیں گرفتار کرتی ہیں۔ گرفتاری کے بعد افتخار کو طرح طرح کی خطرناک سزاؤں سے گزرنا پڑھتا ہے یہ سزائیں اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ جس سے سن کر ایک عام انسان کی روح کانپ جاتی ہے اس حوالے سے افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ:۔

"افتخار عرف جانباز نماز کو ایک بول کے ساتھ باندھا گیا یا پھر ماچس کی تیلی جلا کر کر اس کے چہرے کی داڑھی کے پاس اس لائی گ ء۔ داڑھی جلتے ہی اس کے منہ سے چیخیں نکلیں لگیں۔ جب ان کا منہ جلنے لگا تو اس آگ پر کپڑا رکھ کر بجھا دیا گیا۔ البتہ درد کا یہ پہلا مرحلہ اتنا اذیت ناک تھا جس میں

جسمانی کے ساتھ اس کی روحانی اذیت بھی شامل تھی اور دینی مداخلت بھی۔دوسرے مرحلے میں گالیاں دے دے کر لوگوں وارتقا گھو آنسوں سے اسے آدھ مرا کر دیا گیا۔جب وہ منہ اور ناک سے خوں دینے لگا تو اسے رسیوں سے کھول کر نیچے فرش پر لٹا دیا گیا۔جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے خود کو ننگا پایا اس کے آلہ تناسل میں ایک سپاہی ڈال جانے لگی۔جب وہ چیختے چلانے لگا تو ایک سپاہی نے اس کے دونوں بازوں نوک دار جوتوں سمیت اپنی لوگوں میں دبا کر رکھدئے۔"(ایضاً)

یہ سزا پوری ہونے کے بعد افتخار کو جموں شفٹ کیا گیا ہے۔وہی ایک دن اس سے ہوٹل میں اکیلے بٹھایا جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات شیر خان نامی ایک شخص سے ہوتی ہے شیر خان بھی ایک ایک عسکریت پسند ہوا کرتا تھا مگر اب وہ تحریر کو چھوڑ کر ہندوستانی فوج کے ساتھ مل چکا تھا اس کا نظریہ پوری طرح سے بدل گیا تھا وہ وہ افتخار کو اس تحریک کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر افتخار یار خود اس سے کافی ناخوش تھا وہ اس کی تبدیلی پر اسے ہی برا بھلا کہتا ہے۔تب شیر خان ان کو بتاتا ہے کہ وہ سزا کو دیکھ کر برداشت نہیں کر پایا اور دوسری طرف سے ایمان بھی اتنا پختہ نہیں تھا کہ وہ سزا کو برداشت نہیں کرتا اور حکومت نے اسے 50000 ہزار کی لالچ دی اس کا ایمان اتنا پختہ نہ تھا کہ وہ سزا کو برداشت کرے اور پیسوں کو ٹکرائے لہذا اس نے اپنا راستہ بدل لیا۔افتخار نے اسی دوران شیر خان سے اپنی بیوی اور گھر بار کے بارے میں پوچھا اس کے جواب میں شیر خان نے اسے بتایا کہ فورس نے اس کی ماں، بیوی اور بھابھی کی عصمت دری کی اور اس کے باپ کو جیل میں قید کر رکھا ہے یہ سن کر افتخار ٹوٹ جاتا ہے مگر وہ اپنا نظریہ نہیں بدلتا۔اس کے بعد افتخار کو جموں سے تہاڑ جیل منتقل کر دیا جاتا ہے یہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد اسے رہا کر دیا جاتا ہے۔رہا ہونے کے بعد افتخار دہلی شہر میں میں قیام کرتا ہے اور اپنی بیوی کو دلی بلواتا ہے۔اس سزا کے دوران اس کے والد اور ماں کی موت ہو جاتی ہیا ور بیوی ساجدہ اپنے میکے جا کر رہا کرتی ہے۔کچھ دنوں کے بعد ساجدہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ دلی پہنچتی ہیا فتخار ساجدہ کو لے کر ایک ہوٹل میں رات کو رکنے کے لیے جاتا ہے کہ اچانک رات کو پولیس کمرے میں دستک دیتی ہے پولیس والے افتخار کو زبردستی گرفتار کر لیتے ہیں اور دوبارہ جیل میں ڈال دیتے ہیں ایک سال کے بعد جب افتخار کو رہا کیا جاتا ہے۔تو پھر دلی شہر میں ساجدہ کی تلاش شروع کر دیتا ہے ہے۔کافی دنوں تک مختلف جگہوں پر وہ ساجدہ کو تلاش کرتا ہے مگر اس سے ہر جگہ مایوسی ہی ہاتھ لگتی ہے۔ایک دن وہ ایک ہوٹل میں رات گزارنے کے لیے جاتا ہے تو ہوٹل والا اسے رات کے لیے ایک عورت مہیاں کرتا ہے۔افتخار جو لگ بھگ اپنا دماغی توازن کھو چکا تھا۔اس بات پر لاشعوری

طور پر حامی بر لیتا ہے۔لیکن بعد میں اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ گناہ ہے اسی کشمکش میں ایک عورت دروازے سے داخل ہو کر سیدھے واش روم میں چلی جاتی ہیں۔افتخار اسے دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے اور پھر وہ جلدی سے اپنا سامان سمیٹ کر چھپ کر کمرے سے بھاگ جاتا ہے۔اس صدمے کے بعد وہ پاگل ہو جاتا ہے اور دلی کی گلیوں میں گھوم گھوم کر کبھی ساجدہ تو کبھی آزادی مانگتا ہے اور یہی پر افسانے کا اختتام ہو جاتا ہے۔

افسانے کے موضوع پر اگر بات کرے تو افسانہ قاری کو ان تمام حالات سے واقف کراتا ہے جو وادی میں سیاست کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ طرح لوگوں کے ساتھ ظلم و جبر سے ان کے حقوق کو باز رکھا جاتا ہے جن حقوق کے وہ مستحق ہوتے ہیں عورتوں کے ساتھ زیادتی، عصمت دری، آبرو ریزی حقوق کی پامالی اور مصلحت کے واقعات مصنف نے ان تمام واقعات کو بے باقی اور بہادری سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔تحریک کشمیر سے پیدا شدہ مسائل نے کشمیر کی عوام زندگی کو بے حد متاثر کیا ہے ان مسائل کا آثار ادباء پر پڑھنے پر فطری ہیں۔مگر وادی کا ماحول کچھ اس طرح کر دیا گیا ہیکہ کوئی چارہ کر بھی ان مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع نہیں بنا سکتا۔اس معاملے میں شبنم قیوم وادی کے واحد فکشن نگار ہیں جنہوں نے بے باکی سے اس مسلے کو نہ صرف اپنے افسانوں میں بلکہ اپنے بالوں میں بھی جگہ دی ہے۔

یہ افسانہ وادی کے سچے حالات بیان کرتا ہے وہ حالات جن کی وجہ سے جموں و کشمیر کو جانا جاتا ہے۔ان حالات کو شبنم قیوم نے بڑے دین داری، بے باکی اور جرت مندی سے پیش کیا ہے۔اس افسانے میں جہاں افتخار اپنے حق کے لیے بغاوت پر آمادہ ہوتا ہے۔تو وہی ان کے والدین اور بیوی خام خواہ ہزاروں مسائل سے الجھ کر ہار جاتے ہیں۔ایک ماں اپنے بچے کی زندگی کو برباد ہوتے ہوئے دیکھتی ہے مگر کھچ کر نہیں سکتی اگر وہ آواز بھی اٹھائیں تو اسے گناہ سمجھ کر آزادی جاتی ہیں۔ایک بیوی اپنے شوہر کو بچانے کی خاطر ہزاروں دکھوں کو گلے لگا لیتی ہیں۔اگر وہ بھی آوازی صدا بلند کرے تو اس کی عزت پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ایک بیکار چیز سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔اسی ایک باپ جو ہزاروں جدوجہد کرنے کے بغیر اپنے بچوں کو پاؤں پر کھڑا کرتا ہے وہ اس بچے کو دوبارہ پاؤں پر گرتے ہوئے بس دیکھتا ہے۔مگر سمبھالنے کی اجازت نہیں ملتی یہی وہ مسائل ہے۔جن کو یہ افسانہ موضوع بناتا ہے۔

فنی اعتبار سے افسانہ بالکل پختہ ہے۔شبنم قیوم نے اسلوب پر خاص توجہ دی ہے اس لیے

افسانہ کی زبان اور تکنیک رکھتے ہوئے دلچسپی کا محاسبہ کرتا ہے۔افسانے کے یوں تو کئی کردار ہیں مگر افتخار اور ساجدہ کے اردگرد پوری کہانی گھومتی ہیں اور ان ہی کرداروں کے ذریعے افسانے کا موضوع جڑا ہوا ہے۔افسانے میں وحدت تاثر کی کمی محسوس ہوتی ہے آخر میں ساجدہ کا غائب ہونا پھر اس کا طوائف بن جانا قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے مگر اس سے پہلے پورا افسانہ آزادی کی جدوجہد کو موضوع بناتا ہے۔من جملہ افسانہ آزادی کی تلاش اکیسویں صدی میں لکھے گئے افسانوں میں اہمیت رکھتا ہے اور اسی نسبت سے یہ جموں وکشمیر کا دو ہزار کے بعد نمائندہ افسانہ مانا جائے گا۔

☆☆☆

Asi Fayeqi : Bahiasiyat Nazm Go by Mohammed Altaf Ansari (Asst. Prof Urdu, Seva Sadan Mahavidyalaya,Burhan pur) cell-9827568987

**محمد الطاف انصاری** (اسسٹنٹ پروفیسر اردو، سیوا سدن مہاودیالیہ، برہان پور)

# عاصی فائقی: بحیثیت نظم گو

کبھی کبھی کسی شخص کی ادبی شناخت کے محاصل میں سماجی، سیاسی عوامل کے محرکات، ادبی تحریک یا پھر ٹریڈ یونین کے علاوہ مختلف نوعیت کے اداروں میں کی گئی ملازمتیں بھی اس کی کارگزاری کے دوران میں اسے گوناں گوں تجربات و مشاہدات سے ہمکنار کرتی ہیں، اس طرح سے کہا جاسکتا ہیکہ صاحبِ منصب میں اگر ادبی شعور اور تخلیقی قابلیت ہے تو وہ اپنی اس خصوصیت سے ادبی شہ پارہ تیار کرلیتا ہے۔ اس شہ پارے کو آپ چاہے نثری یا شعری زمرہ کا حامل مواد کہہ سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا پس منظر میں شیخ عبدالبصیر المتخلص بہ عاصیؔ فائقی کا اسمِ گرامی لیا جاسکتا ہے۔

عاصیؔ فائقی کا جنم ۸/اگست ۱۹۳۰ء کو محلہ کارنج بازار، برہانپور میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت وعلم وعروض مولوی معین الدین صاحب سے حاصل کی۔ جو ابتداً حکیمیہ ہائی اسکول، برہانپور میں معلم ادبیات تھے اور بعد ازاں سیوا سدن کالج، برہانپور کے صدر شعبۂ اُردو، فارسی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ آپ نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھیں کھولی جو فنی اعتبار سے تو کافی مشہور ومعروف تھا، لیکن شعروادب سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ آپ کے جدِّ امجد شاہی دور میں جنگی ہتھیار بنانے میں ماہر تھے۔ والد ماجد شیخ عبدالعزیز میونسپل کمیٹی برہانپور کے محکمۂ صفائی میں بحیثیت صنّاع ملازم تھے۔ باوجود اس کے آپ نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور فوڈ ڈپارٹمنٹ میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ آپ کی تین صاحبزادیاں پیشۂ درس وتدریس سے وابستہ رہیں۔ آپ نے ملازمت کے سلسلے میں کھنڈوہ شہر کو وطن ثانی بنایا۔

عاصیؔ فائقی کو شاعری کے علاوہ مضمون نگاری، ظرافت نگاری، انشا پردازی وخوش خطی اور فنون لطیف (آرٹ) ڈرائنگ میں بھی فطری طور پر دلچسپی تھی۔ ۵۵۔ ۱۹۵۴ء میں ادیب ماہر کے امتحانات پاس کئے۔ لڑکپن سے ہی طبعیت شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ طالبِ علمی میں ہی تقریباً چودہ

سال کی عمر میں ایک غزل کہی، جس کا مقطع یوں ہے۔

قدم ہر قدم پر تبسم تھے لٹتے کسی ناز پرور کو عاصیؔ نے دیکھا

شعروشاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۵۸ء سے کیا۔ فنِ شاعری میں استاد شاعر حکیم و ڈاکٹر صلاح الدین فائقؔ سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ جن کا شجرۂ شاعری اختر نعمانی اور نواب مسائل دہلوی سے ہوتا ہوا، داغؔ دہلوی سے وابستہ ہے۔ اس طرح عاصیؔ فائقی کو شجر دانے کی ایک پھل دار ٹہنی بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مورخہ ۲/اکتوبر ۱۹۶۹ء کو اُردو کے ''شریشٹھ شاعر'' کے اعزاز سے نوازہ گیا۔ ۲۴/دسمبر ۱۹۹۲ء کو انتقال فرمایا۔

عاصیؔ فائقی کے پانچ شعری مجموعہ ''طاق نسیان'' ۱۹۸۱ء، ''زرگل'' ۱۹۸۷ء، ''التحیات'' ۱۹۸۸ء، ''شہرخوباں'' ۱۹۹۰ء اور ''شہرگل'' ۱۹۹۲ء میں زیورطبع سے آراستہ ہوئے۔ عاصیؔ فائقی ایک خوش فکر اور زود گو قادرالکلام شاعر ہیں۔ آپ نے متعدد اصناف سخن حمد ونعت، منقبت، غزل، نظم، رباعی، قطعات وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ حضرت عاصی فائقیؔ جو کچھ محسوس کرتے ہیں۔ اسے نہایت سادہ اور آسان زبان میں شعری جامہ پہنا دیتے ہیں۔ ان کے اشعار زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ آپ کے کلام میں جہاں سادگی ہے تو وہیں پرکاری بھی ایک طرف زبان کی شیرینی ہے تو دوسری طرف تغزل کی رنگینی اور ساتھ ہی فصاحت کا رنگ بھی ہے۔ ان کے کئی اشعار میں زندگی کے اہم تقاضوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ درس اخلاق وکردار کے ساتھ ہی بعض اشعار میں دنیا کی بے ثباتی اور گردشِ لیل ونہار کی ستم ظریفی کا شکوہ بھی ملتا ہے۔ بقول پروفیسر عبدالقوی دسنوی: ''بلاشبہ جہاں وہ قدیم رنگِ شاعری کے ترجمان ہیں وہاں ان کی شاعری میں عہد جدید کے تقاضوں کو سمجھنے اور برتنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔''[۱]

عاصیؔ فائقی کی شاعری میں سوز وگداز، جذبات کی فراوانی، تخیل کی پاکیزگی، تفکر میں استحکام، زبان و بیان کی صحت، نیز روانی وسلاست موجود ہے۔ ان کے یہاں عشق ومستی، شعور وادراک، کیف وسرور، پند ونصائح، کائناتی بصیرت، حق ومعرفت کی عظمت اور اسلوبِ بیان، سب ہی کچھ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ عاصیؔ فائقی نے اگرچہ روایت کے مطابق اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور بہت مدّت تک وہ روایتی انداز میں غزل کہتے رہے لیکن جب ہم مجموعہ کلام ''شہرگل'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں غزلوں کے علاوہ جاپانی صنف سخن ''ہائیکو''، ''واکا''، ''رباعیات''، ''قطعات''، ''تشطیرات''، تضمین اور نظموں میں پابند نظمیں، معرا نظمیں، آزاد نظمیں،

نثری نظمیں، سانیٹ اور سہرا، عروسی تہنیت (رخصتی) جیسے اصناف سخن جو مشرقی تہذیب وثقافت کا اہم حصّہ ہیں، شامل ہے۔ آپ نظم کے متعلق سے خود ہی فرماتے ہیں۔

عاصیؔ غزلیں کہتا ہے نظموں کا بھی ناظم بن ۲ ؎

آپ کی مشہور پابند نظموں میں ''ذرا اور ٹھہر''، ''جان جاں! جانِ من''، ''بحضور غالب''، ''محل گل آرا''، ''ترنگا''، ''پرچم ہند''، ''شراب بندی''، ''حسن عمل''، معرا نظموں میں ''حسنِ صورت''، ''ترغیب''، ''ملاقات''، ''لمحۂ فکر'' آزاد نظموں میں ''پیپرویٹ''، ''سنگ میل''، ''ایک خاتون افسر''، ''شناخت''، ''گلہائے گل'' نثری نظموں میں ''انتہائیاں''، ''تنہائی''، ''آبِ حیات''، ''زبوں حالی''، ''در پردہ'' اور سانیٹ میں ''بنت کلیسا''، ''ممتاز محل''، ''متشاعر''، ''ایکتا سندیش''، ''آرزو'' وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ جدید اُردو اصناف کے پس منظر میں بیرون ممالک کے ادب شعری کے تتبع میں آپ نے اپنی کاوشوں کو مشقی طور پر جانچا پرکھا ضرور ہے لیکن مشرقی اُردو ادب میں یہ عام اور مروج نہیں ہوسکی ہیں۔ موصوف شاعر عاصیؔ فائقی نے اپنی نظم ''ذرا اور ٹھہر'' میں اپنے معشوق سے لطف وصال کیلئے جس انداز کو اپنایا ہے اس میں انہوں نے معشوق کی تعریف میں اس کو رجھانے کیلئے جن خوبصورت لفظیات کا استعمال کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک خصوصی اہمیت رکھتی ہے اور بے ساختہ قاری کی زبان سے بہ الفاظ شاعر یہ مختصر جملہ نکل جاتا ہے ''دیکھ تو لوں تجھے جی بھر کے، ذرا اور ٹھہر''۔ لہٰذا میرے نزدیک یہ نظم پابند نظم کے زمرے میں بطور مثال لکھی جاسکتی ہے۔

چاندنی رات میں چہرے کا حسیں تاج محل عنبری سانسوں کے دریا میں یہ ہونٹوں کے کنول
زلفِ شب رنگ میں ہے جلوۂ محبوب سجل تو تو لاثانی ہے، ثانی! نہیں تیرا بدل
اے شبستانِ غزل، روحِ غزل، جانِ غزل دیکھ تو لوں تجھے جی بھر کے ذرا اور ٹھہر

میری محبوب نظر

نظم ''گل آرا'' میں عاصیؔ فائقی نے تاریخی لحاظ سے آثارِ صنادید کے تعلق سے برہانپور شہر کے اس تاریخی مقام کے تفریح گاہ کے منظر کا عکس اپنی شعری لفظیات کے ذریعہ پیش کیا ہے، جو ایک ان دیکھے ناظر کے سامنے اس کا عکس ہو بہو آنکھوں کے سامنے جسے انگریزی زبان کی اصطلاح میں Real Scanery کہہ سکتے ہیں یہ آپ کے اپنی شعری انشائیہ کی لاجواب نظم کہلائی جاسکتی ہے۔

مغلیہ دور کی تعمیر محلِ گل آرا خوشنما غیرتِ کشمیر محل گل آرا
سرو سنبرہ گل صد برگ گلابوں والا یاد آتا ہے مجھے گاؤں وہ محلوں والا

خداوند قدوس جس طرح بے نیاز اور اپنی قدرت کاملا پر قادر ہے اسی طرح سے اس روحِ زمین پر اپنے نائب اور خلیفہ یعنی حضرت انسان کو اپنی نوری تجلّی سے معمور کر کے بشری لبادے میں مبعوث فرمایا ہے۔ اسی بات کو نظم ''انتہائیاں'' میں شاعر نے فلسفہ کے طور پر پیش کیا ہے کہ جس طرح ہر انسان کو خدا نے آزاد پیدا کیا ہے، لیکن ساتھ ہی اس کی حدیں بھی بتادی ہیکہ اگر انسان ان حدود کو پامال کرتا ہے تو پھر اس کے لئے اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لہٰذا بلا مبالغہ ہم کہہ سکتے ہیں عاصیؔ فائقی نے تمام روح زمین کے خطہ پر رہنے، بسنے والی مخلوق کیلئے ایک ایسا اصلاحی نکتۂ نظر سے پیغام بشریت کا درس دیا ہے۔

شعور ادراک — خداشناسی
مقامِ شعور — جنت سے عبارت
باشعور انسانوں کی آبادانی — اور
بےشعور لوگوں کا ٹھکانہ — جہنم سے تعبیر

عاصیؔ فائقی کی نظم ''ملاقات'' شاعر کے اضطراب و بے چینی کو عیاں کرتی ہے، یہ ایک معرا نظم ہے اور جس میں صنعتِ تلمیح کا استعمال بھی کیا گیا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ رب العزّت کے دیدار کی تاب نہ لا سکے، اس کیفیت کو شاعر نے اپنی اس نظم میں پیش کیا ہیکہ معشوق کے دیدار کی خواہش تو پوری ہوگئی، لیکن جذبات، رعبِ جمال کی وجہ سے سرد پڑ گئے اور جو خواہشیں تھی وہ ساری زندگی اسی انتظار میں گذر گئی۔

جو بات تھی زباں پہ وہ ہرگز نہ کہہ سکے — لیکن کسی کی دید کا پیہم یہ تذکرہ
موسیٰ کی ''لن ترانی'' سے کچھ کم نہیں رہا — لے کر چلا جو طور کی جانب فراز پر
جذبِ فراز کوہ پہ بے ہوش کیا ہوئے — گویا قریب موت کے سائے کے آ گئے

رب تعالیٰ نے انسان کا وجود کس طرح کیا ہے اسی فلسفہ کو شاعر نے نظم ''گلہائے گل'' میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح مٹّی کے ڈھیر سے پیڑ، پودے، پھل پھول، بیل، بوٹے، دنیا کیا رنگینیاں پیدا ہوتی ہے اور انھیں سے انسان کو غذائیں میسّر ہوتی ہے۔ ''رگِ گل'' کی طرح انسانی جسم میں بھی خون بنتا ہے اور پھر یہی خون انسانی وجود کا سبب بھی۔ جو قرآن پاک کی آیت کریمہ ''خَلَقْنَا مِنْھَا'' سے ثابت ہے۔

ان سے پیدا ہوئیں — انسانی غذائیں کتنی

رگِ گُل کی طرح عالم اجسام میں نبضیں دوڑیں
اور پھر خون بنا خون سے انساں کا جنم
یعنی خَلَقْنَا مِنْھَا ط

نظم ''در پردہ'' رومانی حیثیت کی حامل آزاد نظم ہے جس میں شاعر نے معشوق کے سراپا حسن، زلف، لب ورخسار وتبسم، چال وادا وغیرہ کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں پیش کیا ہے ساتھ ہی اپنی پیکرِ شرم وحیا، جان حیات سے ملاقاتیں دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔

سر سے پا تک تری تصویر سہانی دیکھی باغِ عالم میں انوکھی یہ جوانی دیکھی
پیکرِ شرم وحیا! جان حیات میری منظورِ نظر!
تجھ کو ملنا ہے اگر؟ دور دنیا کی نگاہوں سے، حجابوں میں کہیں
مجھ سے درِ پردہ ملا کر، یوں سرِ راہ نہیں

مغربی شعروادب کی ایک صنف سانیٹ جو ۱۴ مصرعوں پر مبنی ہوتی ہے آج کل اُردو شاعری میں بھی اس صنف پر خوب طبع آزمائی ہورہی ہے، جب ہم عاصیؔ فائقی کے مجموعہ کلام ''شہرِ گل'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بھی اسمیں کئی سانیٹ ''ممتاز محل''، ''شاعر''، ''ایکتا سندیش''، ''آرزو اور بنتِ کلیسا (حسین منظر)'' وغیرہ نظمیں ملتی ہیں۔ ''بنتِ کلیسا'' رومانوی انداز کی ایک پرکشش نظم ہے، جس میں شاعر نے صنعتِ تشبیہہ کا استعمال کرتے ہوئے محبوب کی کلائی کو شاخِ طوبیٰ سے تشبیہہ دی ہے ساتھ ہی اپنے محبوب کو پری رو، خوبرو، جلوہ فگن، زہرہ بدن، تنویر سحر، صبح کی روشن جبیں جیسے نام سے مخاطب کیا ہے۔

شاخِ طوبیٰ سی کلائی، موسموں سے بے خبر صفحۂ شرم وحیا پر صورتِ ارقام ہے
ڈوبتے سورج کے غازہ میں شگفتہ شام ہے ہر نظر پر کیف منظر، ہر ادا جادو اثر

غرض کہ عاصیؔ فائقی کی نظمیہ کاوشات میں متعدد موضوعات کی جلوہ گری موجود ہے، پھر چاہے وہ شخصی نظم ہو، رومانوی ہو، تاریخی حیثیت کی حامل، اصلاحی ہو، وطن پرستی، وطن دوستی، بساطِ زندگی ہو، نام ونموس کی بات ہو، فلسفہ حیات ہو، زبوں حالی ہو یا پھر بھائی چارہ وغیرہ موجود ہیں۔ بلاشبہ برہانپور میں نظم گو شعراء کی فہرست میں عاصیؔ فائقی ایک اہم اور معتبر نام ہے۔

حواشی 1۔ مجموعہ کلام ''شہرِ گل''۔ عاصی فائقیؔ، صفحہ نمبر ۲۱۹
۲۔ مجموعہ کلام ''زرِ گل''۔ عاصی فائقیؔ، صفحہ نمبر ۷۰ ☆☆☆

Kachu Isfandyar Khan ki Inshaiya Nigari by S. Mashooq Ahmad

ایس معشوق احمد cell-8493981240

# کاچو اسفندیار خان کی انشائیہ نگاری

وادی کشمیر میں بے شمار ادیب افسانوی ادب کی آبیاری کرنے میں منہمک ہیں۔اس کے برعکس کم ایسے ادیب ہیں جو غیر افسانوی ادب کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔آئے روز افسانوی مجموعے منظر عام پر آرہے ہیں لیکن خال خال ہی خاکوں اور انشائیوں کے مجموعے قارئین کی دلبستگی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔غیر افسانوی ادب کو قحط جیسی صورتحال کا سامنا ہے ایسے میں اگر رحمت باراں کی مانند کوئی انشائیوں پر مشتمل مجموعہ منظر عام پر آئے تو وہ بے اعتنائی کا شکار ہوجاتا ہے اور ناقدین اس کی پذیرائی نہ کے برابر کرتے ہیں۔اس رویے سے دل برداشتہ ہوکر اکثر انشائیہ نگار مایوسی کا شکار ہوجاتے ہیں لیکن اس کے باوجود چند ایسے جیالے ہیں جو صنف انشائیہ کو فروغ دے رہے ہیں اور لگاتار انشائیے رقم کر رہے ہیں ان میں ایک نام کاچو اسفندیار خان کا بھی ہے۔کاچو اسفندیار خان کا تعلق کرگل سے ہے۔اردو، بلتی پورگی زبانوں میں شاعری کرتے ہیں اور انگریزی زبان میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔آپ کے انشائیوں کا مجموعہ پرکالہ گفتار 2022ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں کل سولہ انشائیے شامل ہیں۔

ہمارے ہاں اکثر کتے کسی اجنبی کو دیکھ کر بھونکنا شروع کرتے ہیں۔کاچو اسفندیار خان نے اس واقعہ کی بنیاد پر انشائیے کی خوبصورت عمارت تعمیر کی ہے۔کہانی کتوں کی میں بیس برس قبل کتے ہر اجنبی پر بھونکتے تھے لیکن بیس برس بعد جب انشائیہ نگار کتوں کی معاشرتی زندگی کا جائزہ لیتا ہے تو انہیں لگتا ہے کہ کتوں کی سماجی زندگی انسانوں کی زندگی سے زیادہ متوازن اور منظم ہے۔انسان اضطراب اور بیقراری کی حالت میں ہے جبکہ کتوں کی زندگی میں پختگی اور ٹھہراؤ آ گیا ہے۔کہانی کتوں کی میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ____

"سماجی طور پر کتے کثیر الازدواجی طرز زندگی کو اپناتے ہیں البتہ ان کی بیگمات کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔کسی کو زیادہ پیار اور خرچہ پانی نہیں ملتا ہے کیونکہ کتوں کی بیگمات کو اپنے خرچے پانی کا خود انتظام

کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ ان میں بناؤ سنگھار کا کوئی رواج بالکل نہیں ہے اس لئے صاحب خانہ کو یہ فکر لاحق نہیں رہتی کہ صرافہ بازار میں سونے چاندی کا بھاؤ کیا ہے۔ اسی طرح ان کی بیگمات کو دورِ جدید کے مصنوعی تیلوں، پاؤڈروں اور فیرانیڈ لاولی کی خیرہ کن ڈبیوں سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔"

ہمارے سماج اور انسان کو مختلف بدعات، غیر ضروری رسومات، ظاہرداری، برائیوں اور بری عادتوں نے کھوکھلا کیا ہے۔ ہماری طرزِ زندگی سادگی کا پیکر ہونی چاہیے تھی لیکن ہمارا دستور العمل بدل گیا ہے جس کی بدولت ہماری زندگی کتوں سے بھی بدتر ہوگئی ہے۔ کہانی کتوں کی میں انشائیہ نگار نے عمدہ اسلوب میں طنز کے تیر برسا کر قاری کی سوچ کو بیدار کیا ہے جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں کہ مکمل انشائیہ پڑھنے کے بعد قاری کو یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ کتوں کی زندگی انسانوں سے سو درجہ بہتر ہے۔ ان کے بچے فرمابردار اور خود ہی علم سے لیس ہوتے ہیں ____:۔

"کتے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بالکل فکرمند نہیں پائے گئے کیونکہ ان کے بچے خود مادر فطرت کی کھلی کتاب سے علم و دانش کے موتی حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے ان کو انسانی بچوں کی طرح کسی منظم اسکول سے درس و تدریس حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہے۔ اپنے بچوں کے اسکول داخلے کے واسطے نہ تو انہیں کسی اسکول کے نامعقول پرنسپل کے آگے گڑگڑانا پڑتا ہے اور نہ ہی اسکول کے صدر دروازے پر رات بھر بستر بچھا کر سونا پڑتا ہے۔ پھر بھی ان کے بچے نہایت ہی فرمابردار اور بااخلاق ہوتے ہیں۔ بزرگوں کی عزت و توقیر کرنا ان کی جبلت میں شامل پایا گیا ہے۔"

اس انشائیے میں ان تمام برائیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جن میں انسان مبتلا ہیں اور اشرف المخلوقات کو جن صفات سے لیس ہونے چاہیے تھا وہ تمام اوصاف اور اخلاق حمیدہ کتوں میں دکھائے گئے ہیں۔

الیکشن میں الیکشن کے دوران کی گہما گہمی، امیدواروں کی فہرست اور لیڈروں کے وعدوں کو موضوع بنایا گیا ہے، انگور کی بیٹی میں شراب کی خرابیوں کو بیان کیا گیا ہے، میرا وطن کشمیر میں کشمیر کو اس خرگوش سے تشبیہ دی گئی ہے جس کو دیگر جانوروں کی بچی کھچی مٹی سے تخلیق کیا گیا ہے اور اس میں کشمیر کے تین خطوں پر انشائیہ نگار کے بجائے ایک تاریخ دان نے روشنی ڈالی ہے۔ انشائیہ فن نقادی میں کاچو اسفند یار خان نے فن نقادی کا باوا آدم ابلیس کو مانا ہے کہ انہوں نے ہی سب سے پہلے خدا کے تخلیق کردہ جانوروں میں نقص نکالے اور آدم کے حوالے سے رب سے کہا کہ باقی جانوروں کی چار ٹانگیں اور اس کی فقط دو۔ شاعری کو جزوِ پیغمبری تو سب مانتے ہیں لیکن کاچو اسفند یار خان نے فن

نقادی کو جزو ابلیسی مانا ہے۔خدا جانے نقادوں نے ان کا کیا بگاڑا ہے کہ وہ انہیں بالکل ہی ناکارہ مانتے ہیں لکھتے ہیں کہ ___

"سماج کے کچھ فرد شعر و شاعری کرتے ہیں، کچھ کہانی لکھتے ہیں، کچھ ناول لکھتے ہیں لیکن لکھنے والوں میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود ہے جو نہ تو شاعری کر سکتا ہے، نہ کہانی یا افسانہ لکھ سکتا ہے اور نہ ناول لکھ سکتا ہے تو بادی النظر میں وہی طبقہ نقاد بن جاتا ہے اور ادبی تنقید کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیتا ہے اور اپنی فرسودہ اور زنگ آلودہ انسلاکاتی و اسلوبیاتی تلواروں سے بہت سارے ادب پاروں کو بڑی بے دردی سے تہہ تیغ کرتا رہتا ہے اور خم ٹھونک کر کہتا ہے کہ صرف ابہام ہی وہ نسخہ کیمیا ہے جس سے شعر کو آفاقی بنایا جا سکتا ہے اور جو شعر انسان کے سرحد ادراک کو چھو لے وہ آفاقی شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔"

ان خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے سامنے ایسے ناقدین کی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے عمدہ افسانے، ناول اور شاعری تخلیق کی ہے اور فن نقادی میں ان کا فرمایا مستند مانا جاتا ہے۔ چوہے گھروں میں کھانے پینے کی اشیاء ہی خراب نہیں کرتے بلکہ ہمارا اوڑھنا بچھونا اور کپڑوں میں بھی بعض دفعہ چھید کر کے انہیں نا قابل استعمال بنا دیتے ہیں۔ایک چوہے کی سرگزشت میں کاچو اسفندیار خان نے بات اس راجستھانی لحاف میں چوہے کے چھید کرنے سے شروع کی ہے جس کے اندر انہوں نے زندگی کے سرد گرم، سہانی راتیں، نوک جھونک، جھگڑے اور پیارے و محبت کے لمحات گزارے ہیں اور جس میں چوہے کا چھید کرنا انہیں اتنا برا لگا کہ انہوں نے بازار جا کر چوہے دانی لائی۔جب اس میں چوہا پھنس گیا تو چوہے نے انکشاف کیا کہ میں وہی چوہا ہوں جس نے نوح پیغمبر کی کشتی میں سوار ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔اس کے علاوہ چوہے نے عورتوں کی فطرت، ان کی بے صبری، حضرت ابراہیم کا خانہ خدا کو تعمیر کرنا، پیارے نبی کی ہجرت، محمد بن قاسم کا سندھ کو فتح کرنا، 1970ء میں چوہے کا کشمیر کا رخ کرنا جیسی ساری روداد بیان کی ہے۔

منطقی انداز، خیالات میں ٹھہراؤ، معلومات بہم پہنچانا، سنجیدہ اور الجھا ہوا اسلوب انشائیہ کی روانی کو متاثر کرتا ہے اور انشائیہ نگار کبھی کسی واقعے کی روداد بیان کرنے لگتا ہے اور کبھی مضمون کے حدود میں داخل ہو کر انشائیہ کی مسند سے اتر جاتا ہے۔ پرکالہ گفتار میں کاچو اسفندیار خان کبھی انشائیے کے بجائے خاکہ رقم کرنے لگتے ہیں تو کبھی مضمون۔" عبدل کی برسی "انشائیہ نہیں بلکہ خاکہ نما تحریر ہے کہ اس میں عبدل کے مرنے کے بعد ان کے گھر کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ان کو یاد کرتے ہوئے ان کی زندگی کے مختلف واقعات کو حوالہ قرطاس کیا گیا ہے۔اسی طرح بربن چن نامی مضمون نما تحریر میں

کرگل میں واقع ایک حسین پہاڑی بربن چن کے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی ہے۔بعض مضمون نما تحریروں سے قطع نظر پرکالہ گفتار میں بعض انشائیوں کی شیریں گفتاری اور کاچو اسفند یار خان کا قوت مشاہدہ لاحق داد ہے۔اس کتاب میں طنز کے تیر تو خوب برسائے گئے ہیں لیکن شگفتہ مزاح کی پھوار کم کم ہی برس رہی ہے اور مزاح کا انتظار خشک سالی میں بارش کی طرح شدت سے رہتا ہے۔البتہ انشائیوں کی زبان میں روانی اور شگفتگی ہے۔کاچو اسفند یار خان نے انشائیوں میں فارسی اشعار اور محاورات کا برمحل استعمال خوبی سے کیا ہے۔مجموعی طور پر دیکھیں تو پرکالہ گفتار میں شامل انشایئے صنف انشائیہ نگاری کے حوالے سے ایک مثبت قدم ہے اور مجھے امید ہے کہ اس راہ پر چلنے والوں کو یہ کتاب منزل کا پتہ دے گی۔

☆☆☆